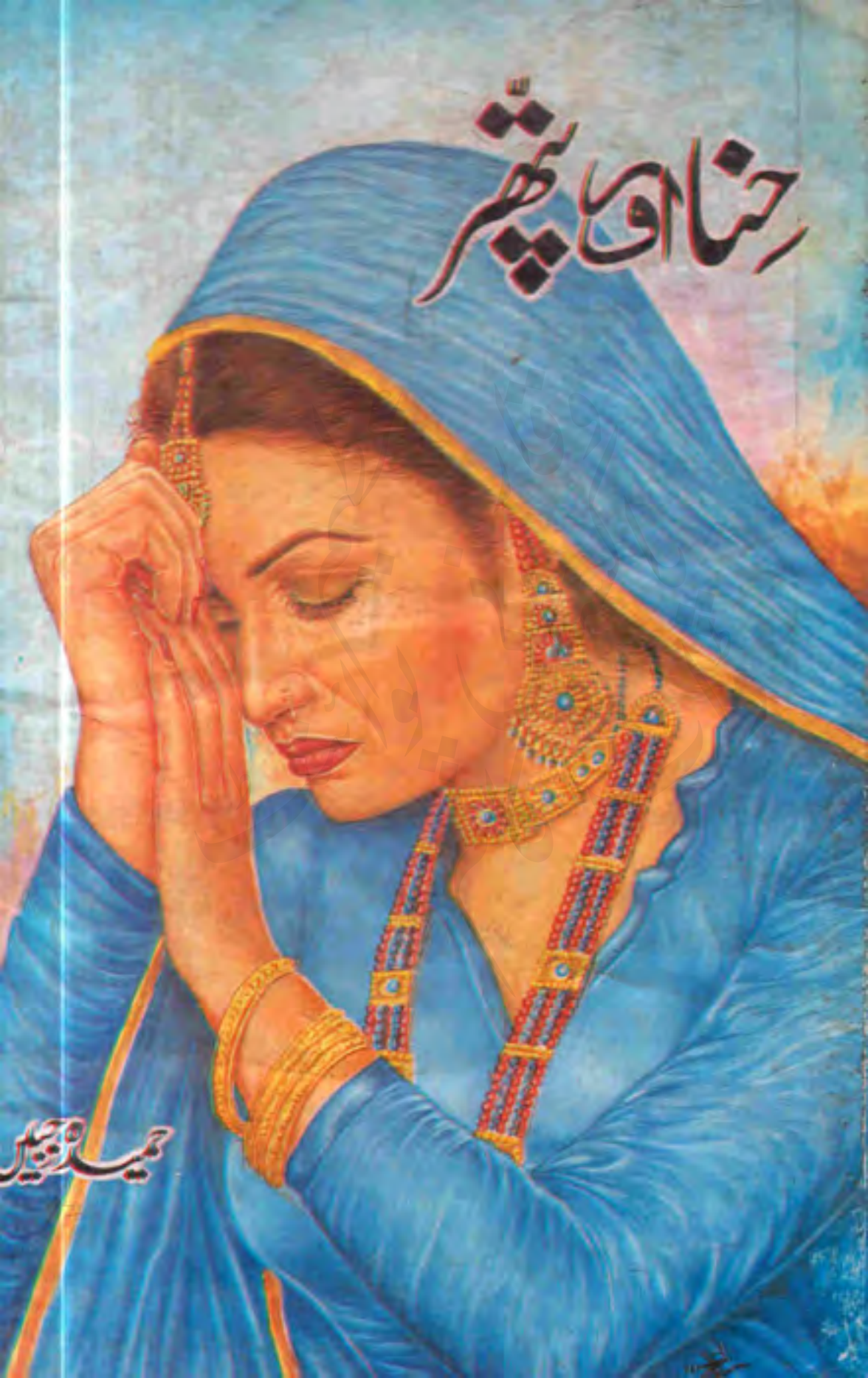


# رہنما فی پھر

میں





”ناصر۔“

”ہوں۔“

”ابھی تک ناراض ہو کیا؟“

”میں ناراض ہو کر کیا کموں گا؟“ وہ ایک غم ناک سی ہنسی ہنس دیا۔

”اچھا‘ اب چھوڑو یہ قصے۔ پکچر کا موڈ بن رہا ہے۔“ نسرین نے انگڑائی لی۔

”تم چلی جاؤ۔“ ناصر بیزاری سے بولا۔

”پھر وہی باتیں۔ آخر تم مجھے سمجھتے کیا ہو۔ میرے ساتھ جاتے ہوئے تمہیں

ڈر لگتا ہے کیا؟“ نسرین تنک کر بولی۔

”چلو‘ میں تیار ہوں۔“ ناصر ایک دم تیار ہو گیا۔

وہ ہمیشہ یونہی اس کی ہر خواہش پوری کرتا چلا آ رہا تھا لیکن اس کی اپنی زندگی سک رہی تھی۔ نسرین نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس کے

دماغ میں ایک ہی بات سمائی تھی کہ وہ امیر ماں باپ کی لڑکی ہے۔ اس کا خاوند غریب بھی ہے اور ساتھ ساتھ اس کے اپنے باپ کے مکڑوں پر پلا ہے۔ وہ ہمیشہ

اسے حقارت کی نظر دیکھتی اور ناصر جیسا انسان اس کی اس نظر سے اٹھتا۔

لیکن وہ مجبور کر دیا گیا تھا۔ وہ بک گیا تھا۔ چاندی کے مکڑوں نے اسے

خرید لیا تھا۔ اس کی انفرادیت کچل گئی تھی۔ سماج کے قانون نے اس کی زبان بند

کر دی تھی۔ وہ کرتا تو کرتا کیا۔

نسرین تیار ہو کر آ گئی۔

اسے ناصر کا یہی روپ پسند تھا یا پھر وہ بدلے رہی تھی۔ مقابلہ کر رہی تھی۔ امیری اور غریبی کا۔ کسی حساس انسان کا تسخیر اڑا رہی تھی۔ کسی حد تک وہ نمیک ہی کر رہی تھی۔ اگر سب اسی طرح ہو جائیں تو درد نہ رہے، کیونکہ درد دینے والا کوئی نہ ہو۔ وہ بھی تو آخر اسی سلج میں رہتی تھی۔ اسی کا ایک فرد تھی۔ اگر درد دینے والا کوئی نہ ہوتا تو دنیا میں کوئی دلکشی نہ رہتی اور وہ تو اس دلکشی کو ابھار رہی تھی۔

پکڑ شروع ہو گئی۔ ناصر کو کچھ پتا نہ چل رہا تھا کہ وہ کہاں پر بیٹھا ہے۔ حسین جوڑے دلفریب ہنسی کے ساتھ فلم دیکھ رہے تھے لیکن وہ بے بق اور مجبور انسان تھا۔ اس کے سینے میں بھی ایک دھڑکتا ہوا دل تھا لیکن وہ دل جو۔ بچہ گیا تھا۔ جس کے تمام دلولے و جوش سرد ہو چکے تھے۔ نرسن کے جسم سے اٹھتی ہوئی مہک اس کے دماغ کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کی نظر اٹھی، نرسن فلم دیکھنے میں مگن تھی۔ اسے نرسن پر ترس آنے لگا۔ ”یوہانی عورت مجھ جیسے دھشاک انسان کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکے گی۔“ اس کے دماغ میں کیا باتیں سما گئی ہیں۔

جو سمجھانے پر بھی باڈ نہ آئی۔

وہ سوچنے لگا۔ ”میں پاگل کیوں نہیں ہو جاتا۔“

انٹروں ہوا۔ نرسن کی سیٹیل مٹی گئی، وہ دوڑ کر اس کے پاس چلی گئی اور وہ اکیلا بیٹھا خیالوں کے تانے بانے بنا رہا اور ان ہی تانوں بانوں میں اچھے ہوئے قلم ختم ہو گئی۔ وہ اس وقت چونکا جب سکرین سفید تھی۔

جب وہ کوٹھی واپس پہنچے تو معمول کے مطابق وہ اپنے ہی کمرے میں جا کر سو رہا۔

آج نرسن کو شاید اس پر رحم آگیا تھا۔ خلاف معمول وہ اس کے کمرے میں تھی۔

رات زیادہ آگئی ہے جاؤ آرام کرو۔ ناصر نے اسے دیکھ کر کہا۔

”جہیں کیا ہو گیا ہے ناصر کیا تمہیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں۔“

اور وہ سر بھٹکائے ہوئے اس کے ساتھ چل دیا۔

”اب یوہانی مسرتے ہوئے چلتے رہو گے۔“ نرسن طنز بولی۔

”چل تو رہا ہوں۔ جہاں چاہو لے چلو۔ میں حکم کا بندہ ہوں۔“ ناصر کے لیے میں درد سمٹ آیا۔

”بس یہی تو باتیں ہیں تمہاری۔ اب آگے ہو تو ذرا اچھی طرح رہنا۔ پکڑ کا مڑا کر کرنا۔“

اور ناصر پکڑ پکڑ ہو گیا۔ نرسن بھی کیا عجیب سی عورت ہے اگر بات کرو تو بھی لڑائی اگر چہ رہو تو بھی لڑائی۔

چلتے چلتے اسے خیال بھی نہ آیا کہ وہ ٹیکسی لے لے۔ ناچار نرسن نے خود ہی ٹیکسی روکی۔ ناصر چپ چاپ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اسے پھر خیالوں نے آلیا۔ وہی بے ربط سے خیالات جن سے وہ بیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ ان خیالوں نے اسے اپنے آپ سے نفرت کروا دی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بہت حقیر سا محسوس کرتا۔

ٹیکسی چلی جا رہی تھی۔ لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ آزاد۔ لفظ آزاد نے اس کے ذہن میں الجھل مچا دی۔

کاش۔ وہ آزاد ہوتا۔

وہ تو قیدی ہے دولت نے اسے تھک لیا اور یہ ٹکٹھ کتنا سخت تھا۔ ٹیکسی ریگل کے سامنے رکی۔ ناصر نے ٹیکسی والے کو پیسے دیئے اور ٹکٹ خریدنے چل دیا۔

باکس میں بیٹھ کر نرسن پھر اس کے دغموں سے کھیلنے لگی۔

”آج ٹیکسی میں آنا پڑا۔ میری کار تو میرے کسی کام نہیں آئی۔ کل سے خالو جان لے گئے ہیں۔ میں تو ٹکٹ آگئی ہوں۔“

ناصر چپ چاپ سکرین کی طرف گھور رہا تھا۔

”آپ بولتے کیوں نہیں؟ آخر آپ اپنے ابا جان کو کیوں نہیں سمجھاتے۔“

نرسن غامخاہ الجھ رہی تھی۔ شاید اسے کسی کو دکھ دینے میں لطف آتا تھا۔ شاید

”محبت۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔

نسرین ہنس دی۔

”تم تو ذرا ذرا سی باتوں کو طول دیتے ہو، بھلا یوں بھی زندگی گزرتی ہے کہیں۔“

ایک بار پھر ناصر نسرین کی باتوں میں الجھ گیا۔ وہ ان غموں سے نجات پانا چاہتا تھا۔ سب کچھ بھولنا چاہتا تھا۔

نسرین سے اس کو کوئی میر نہ تھا۔ نسرین تو خود ہی الجھتی رہتی تھی۔

نسرین کے باتوں کو ماتھے سے ہناتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ وہ رو وے چوں ہی صرح اور اس سے آگے نہ آئے۔

رات گئے تب وہ اپنے نم و مہلاتا رہا۔

☆☆☆

ناصر کی شادی کو سال ہو گیا تھا لیکن پورے سال میں اس نے ایک لمحہ بھی خوشی سے بہرہ نہ کیا تھا۔

شادی کے بعد اس نے نسرین کا محبت سے استقبال کیا تھا لیکن نسرین نے ہمیشہ اسے حقیر سمجھا۔ نادان لڑکی دل میں یہی بات لئے ہوئے تھی۔ ناصر ان کے نوکر کا لڑکا ہے۔ ناصر کی تعلیم اس کے باپ کے خرچ سے ہوئی ہے۔

اور ناصر جو ایک حساس دل رکھتا تھا یہ باتیں برداشت نہ کرتا۔ بے شک وہ غریب تھا۔ اس نے تعلیم بھی خان صاحب کے بل بوتے پر حاصل کی، لیکن اس تعلیم نے اسے قیدی بنا دیا تھا۔ وہ قیدی بن گیا۔ نسرین کا قیدی۔ دولت کا قیدی۔ اپنے باپ کا قیدی۔ نسرین کے باپ کا قیدی۔ پھر ایک قیدی کہ رجبی کیا سکتا ہے۔ بغاوت۔

وہ بھاگ سکتا ہے

لیکن اس خیال کے ساتھ ہی اس کے باپ کی بچی ہوئی عزت کا خاتمہ لازمی تھا۔ اس عزت کے ساتھ اس کے خاندان کی عزت کا سوال تھا۔

بد قسمتی سے ناصر ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ ماں جس کا وہ تصور کیا کرتا کہ اس کی ماں کیسی تھی۔ ماں کو اس نے دیکھا ہی نہیں۔ اسے چھوٹا سا چھوڑ گئی تھی۔

باپ۔ جس نے لوگوں کے اصرار کے باوجود دوسری شادی نہ کی تھی اور ناصر کو ماں بن کر پالا تھا۔ پھر ناصر کیسے اس باپ کو چھوڑ سکتا تھا۔ ان چیزوں کو سوچ کر وہ بغاوت کا خیال بھی دل میں نہ لاتا۔

اپنی زندگی بنانے کے لئے اس نے کیا کیا نہ کیا تھا۔ نسرین کو لاکھ بار سمجھایا۔ یہاں تک کہ اس نے نسرین سے وعدہ بھی کر لیا کہ وہ علیحدہ جا کر رہیں گے۔ جہاں پر وہ خود کمانے گا اور پھر دونوں کے سوا کوئی نہ ہوگا۔

لیکن نسرین نہ مانتی تھی۔ نازوں میں پٹی ہوئی لڑکی بھلا کیسے غریبی کی زندگی بسر کر سکتی تھی اور لڑکی بھی ایسی جس کے سینے میں ایک دل ضرور تھا۔ لیکن وہ دل جو کسی کے لئے دکھتا نہیں تھا۔ اس کو احساس نہ تھا۔ اسے تو بس یہ خیال تھا کہ غریب دنیا میں کیوں پیدا ہوتے ہیں گند چمانے کے لئے۔ بیماریاں۔ املاک۔ تمام برائیاں غریبوں کی وجہ سے ہیں۔ پاگل لڑکی اس پر غور نہ کرتی کہ۔ ان کو غریب بنانے والی کون سی ذات ہے۔ جس نے تمہیں امیر بنایا۔ اور اگر غریب نہ ہوتے تو دنیا میں کوئی دکشتی نہ ہوتی۔ کوئی جہتو نہ ہوتی۔ زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی۔

ناصر سے نفرت کی وجہ یہی تھی کہ وہ غریب تھا۔ ان کا نوکر تھا۔ خان صاحب نے یہی دیکھ کر داماد بنایا تھا۔ وہ اپنی صاحبزادی کی عادتوں سے واقف تھے اور اسی لئے انہوں نے اپنے سینئر کے لڑکے، ناصر کو اپنے خرچ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور پھر جھٹ سے نسرین کی شادی کر دی۔

لیکن یہ شادی جہاں فائدہ مند ثابت ہوئی، وہاں پر ایک زندگی بھی سکے

گئی۔ وہ زندگی تھی ناصر کی۔

جو نسرین کے طعنے سن سن کر عاجز آ گیا تھا۔ اگر وہ تنگ آ کر باپ سے کہتا تو باپ ہنس دیا کرتا۔ وہ ہنستا کیوں نہ۔ جہاں پر وہ میسر تھا اب مل کا مالک تھا۔ سواری کے لئے موٹر کار تھی۔ رہنے کے لئے عالی شان کوٹھی، نوکر چاکر، شہر کے ریسٹورنٹ میں شمار، پھر ایک زندگی بچ کر یہ سودا منگنا نہ تھا۔

ناصر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب نسرین کو اچھا بنانے کی کوشش کرے گا۔ اس کے دل سے یہ بات نکال دے گا۔ وہ نادان ہے۔ وہ پاگل ہے۔ ضرور سمجھ جائے گی۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت محبت ہے۔

”محبت“

اور یہ سکیم سوچ کر وہ مسکرایا۔

اس نے لحاف سے منہ باہر کیا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میز پر پڑی ہوئی گھڑی نے اسے اپنی طرف مخاطب کیا۔ ۹ بج رہے تھے۔

دوسرے بنگ پر نظر گئی۔ نسرین بے خبر سوئی ہوئی تھی، اس کا لباس بے ترتیب سا ہو رہا تھا۔ بال ماتھے پر آگئے تھے۔ وہ اٹھا اور نسرین کو جھنجھوڑنے لگا۔

”نسرین۔“

”ہوں۔ اوں۔“

”اٹھو دن کافی چڑھ آیا ہے۔“

”چڑھنے دو۔ میں نہیں اٹھوں گی۔“ اس نے بیزار سے کڑوٹ بدلی۔

”اٹھو ڈیر آج اتوار ہے نا؟ آج کہیں چلیں گے۔“

”میں نے تو آج غزالہ کے ہاں جانا ہے۔ آپ کے ساتھ جا کر سٹوڈے کا

دن بورگزاروں گی۔“ نسرین انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔

ناصر پٹکی سی ہنسی ہنس دیا۔

”ہم اپنے سلوک کی ملکہ عالیہ سے معافی مانگتے ہیں۔“

ناصر آج تمام طعنے برداشت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں۔“ نسرین نے حیرت سے آنکھیں کھول لیں۔

”جی حضور“ ناصر سر جھکاتے ہوئے بولا۔

نسرین کو ہنسی آگئی۔ آج وہ دونوں ہتھے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔ تیار ہو کر ناشتے پر پہنچے۔

ناصر خوب ہنس رہا تھا، نسرین بھی خوش تھی۔

نسرین نے اپنی چائے پانی اور خالی کپ ناصر کے آگے سرکا دیا۔

”اپنے ہاتھ سے بنائے سرکار۔“

”اچھا جناب“ آج نسرین اچھے موڈ میں تھی۔

”تو پھر کہاں کا ارادہ ہے؟“ نسرین چائے پیتے ہوئے بولی۔

”جہاں جناب کی مرضی ہو“ ناصر اداکاری کرنے پر مجبور تھا۔

”پہلے غزالہ کے ہاں چلیں گے۔ اسے ساتھ لے کر بونگ کی جائے گی۔

اس کے بعد گھر۔ اور گھر سے پھر شام کو شیراز۔ آج وہاں پروگرام بڑا اچھا ہے۔“ نسرین نے پورا پروگرام ایک دم طے کر لیا۔

”ٹھیک ہے، لیکن اگر ہم شام کو شیراز کی بجائے گاؤں کی طرف چلے رات

دیں رہے، صبح سیر کرتے اور پھر واپس۔“ ناصر نے اپنی رائے دی۔

”ایک دم دم بومس۔ یہ آپ گھٹیا باتیں نہ سوچا کیجئے۔ بھلا گاؤں جانا اور اتوار

کے دن مجھے تو کچھ اچھا نہیں لگتا وہاں جانا۔ ہر طرف سڑے ہوئے لوگ، بدبو۔“

نسرین چڑھ گئی۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ ناصر کا چہرہ سوگوار ہو گیا۔

لیکن آج اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اسے اپنائے گا۔

دس بجے تک وہ تیار ہو کر غزالہ کے ہاں جا پہنچے۔

”اوہو۔ آج چشم بد دور، ہمارے غریب خانے پر ناصر صاحب آئے ہیں۔“

غزالہ اسے دیکھ کر بولی۔

”تمہیں تو معلوم ہے غزالہ۔ مولوی صاحب ہیں پورے، آج بھی شکر کرو

لگا کہ آج میرے ساتھ فلیٹی چل رہے ہیں۔ یہی نکتہ جینیاں تو لڑائی کراتی ہیں۔ تم کیا قدر جانو ان چیزوں کی۔“

”بس تمہاری مرضی میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔“ ناصر نے بات کاٹ دی۔ آج وہ اپنے فیصلے پر سختی سے قادر تھا لیکن اس کا دل کا حال خدا جانتا تھا۔ رات گئے تک وہ فلیٹی کے پروگرام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ نسرین نے سچ ہی تو کہا تھا۔ وہاں پر تو بس اسی قسم کے لباس تھے۔ اگر نسرین نہ پہنتی تو واقعی عجیب معلوم ہوتی۔

ایک چیز جب بن جاتی ہے مثلاً یہ لباس کا فیشن ہی تھا۔ کسی نے اپنا یا آہستہ آہستہ بچیل گیا۔ اب جو نہ پہنے وہ جاہل۔ سوسائٹی میں اس کی کچھ بھی عزت نہیں ہوتی۔ معاشرہ اسے اعلیٰ طبقے میں شمار نہیں کر سکتا۔ ایک یہ بھی تو محبت ہے اگر نسرین نہ پہنتی تو وہ چند معلوم ہوتی لیکن نسرین کا تو اپنا من پسند لباس بھی تھا۔

ناصر اپنی نفرت کو دبائے ہوئے اس کا ساتھ دے رہا تھا لیکن سارا دن ہنگاموں میں سرگرم رہنے کے باوجود اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ رو دے، اس کے دل کے داغ سگ رہے تھے۔ اب تو اسے اپنے غم سے محبت اس طرح ہو گئی تھی جیسے اس دنیا میں اس کو سرور ملنے لگا تھا۔

درد میں لذت بہت اشکوں میں رعنائی بہت  
اے غم ہستی تیری دنیا پسند آئی بہت

○

آگے ہیں۔“ ناصر کی بجائے نسرین نے جواب دیا۔

نسرین نے غزالہ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ وہ جھٹ سے تیار ہو گئی۔ غزالہ کا غاوند کراچی میں تھا اور غزالہ میاں پر، دونوں میں ان بن تھی۔ ناصر نے غزالہ کا لباس دیکھا تو اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ آستین غائب، نکیہ نما قفیس، اونچے اونچے بال۔ ایک عجیب سی بن گئی تھی۔ نسرین نے آج ساڑھی پہنی ہوئی تھی لیکن وہ بھی دمنا دمنا ایسے لباس استعمال کرتی رہتی تھی جس سے ناصر کو چڑھتی۔

دو بیچ تک وہ بونگ کرتے رہے۔ کھانا ہوٹل میں کھایا۔ دریا پر بڑی رونق تھی۔ لوگ جا بجا تفریح میں مشغول تھے۔ ناصر بظاہر خوش تھا لیکن روحانی طور پر وہ ایک کرب محسوس کر رہا تھا۔ اس کی روح اسے جھجھوڑ رہی تھی۔ کہ واپس لوٹ چلو، یہ دنیا تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم اس دنیا کو نہیں اپنا سکتے، لوٹ جاؤ۔ واپس چلے جاؤ۔

لیکن اس کا عزم معمم تھا۔ اور اس عزم نے روح کی آواز نہ سنی بلکہ روح کی آواز کچل دی۔

شام کو غزالہ بھی ان کے ہاں آ گئی۔ شیزان کی بجائے فلیٹی جانا طے ہو گیا کیونکہ فلیٹی میں زیادہ اچھا پروگرام تھا۔

نسرین نے بھی غزالہ جیسے کپڑے پہنے۔ ناصر اسے اس لباس میں دیکھ کر تھلا گیا۔

”نسرین ساڑھی تمہیں زیادہ اچھی لگتی ہے۔“ اپنی جھبیلہٹ چھپاتے ہوئے ناصر نے کہا۔

”ہوں۔ ساڑھی۔ یہ لباس تو میں نے ابھی بنوایا ہے۔ کیا میں اس لباس میں حسین نظر نہیں آتی۔“ نسرین ماتھا چڑھا کر بولی۔

”حسین؟ تمہیں اس لباس میں کون سا حسن نظر آتا ہے۔ یہ تو لباس کے نام پر دجہ ہے۔“ ناصر نے نہ رہا گیا۔

”آگے نا اپنی باتوں پر، میں نے بھی کہا کہ آج سورج کون سی طرف سے

اضعی؟

”جی نہیں۔“ ناصر چپ چاپ ناشتہ کرنے لگا۔

”رات معلوم ہوا قحط کیسں گئے ہوئے تھے؟“

”جی ہاں، فلیٹی گئے تھے۔“

”اچھا اچھا۔“ اکبر علی ہنس رہے تھے۔

نسرین آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ سلام نہ آداب، بھلا اپنے منیجر کو وہ سلام کیوں کرتی۔

”آؤ آؤ بیٹی، اچھی تو ہو۔؟“ اکبر علی اسے دیکھ کر بولے۔

”جی ہاں شکریہ۔“ نسرین سرد مہری سے جواب دے رہی تھی۔

”ابا جان۔ ان کی کار کیوں لے جاتے ہیں؟“ ناصر سے نہ رہا گیا۔

اکبر علی کے کہے بیٹے کا نہ دیکھنے لگے۔ ”کیا کہہ رہے ہو ناصر؟“

”جی ہاں، ان کو ضرورت ہوتی ہے۔“ ناصر نسرین کی طرف دیکھنے لگا۔

”چچا جان۔ میں نے تو ایسا نہیں کہا۔ میں نے صرف پوچھا تھا۔“

نسرین مسکرا دی، شاید وہ ناصر کو ہر طرح ذلیل کرنا چاہتی تھی اور عبرت دینا چاہتی تھی کہ یہ ہوتا ہے غریبی اور امیری کا پتھر۔

ناصر اس جھوٹ پر ہنس پڑا۔

اکبر علی بیٹے کی اس بات پر تلملے لگے۔

”میں نے تمہیں اسی بات کے لئے بڑا کیا تھا۔ تم مجھ سے بدلہ لے رہے ہو۔ تم اس شادی سے ناخوش تھے۔ تب تم خوش ہوتے، جب میں بھیگ منگوں میں تمہاری شادی کر دیتا۔“

”ابا جان“ بھیک منگوں کا لفظ سن کر اسے غصہ آگیا۔

”ہاں ہاں ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ ان بیماریوں کے خاندان میں تمہاری خوب

بنتی تھی۔“

”ابا جان۔“ ناصر چیخ کر بولا۔

نسرین حیران ہو کر سن رہی تھی۔ اس کو بھی ایسے وقت میں بدلا لینے کی



رات گئے وہ واپس لوٹے۔

نسرین کچھ سرد مہری دکھا رہی تھی، شاید پرانا مرض پھر حملہ کر رہا تھا۔ اب وہ بیٹی کو شش کر رہی تھی کہ ناصر سے پھر اچھے۔ اسے ٹیکسی پر آنے کا بڑا دکھ ہوا تھا اور اسی بات پر اس نے ناصر کو ہزاروں سنا ڈالیں۔

”میری کار میرے کسی کام کی نہیں۔ خالو جان تو جیسے انتظار میں تھے۔

ہر وقت انہی کے استعمال میں رہتی ہے۔ عاجز آگئی ہوں۔“

ناصر چپ رہا۔

نسرین اس کے چپ رہنے سے چڑ گئی۔

”آپ تو بالکل بول نہیں سکتے۔ میں آخری بار کہہ رہی ہوں، انہیں سمجھا

لیجئے ورنہ میں خود کہہ لوں گی۔“

”خود کہہ لیتا مجھ سے کیوں جھگڑ رہی ہو۔“ ناصر اپنے درد کو کلیجے سے لگائے

اپنے کمرے میں کافی رات تک نہ سو سکا۔

سگریٹ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

رکنا ذرا کہ گردش دوراں سے پوچھ لوں

کس کی تلاش ہے کیا مجھ سے کام ہے

☆☆☆

ناصر کے والد اکبر علی دورے سے واپس آ گئے۔

صبح ناشتے پر ناصر کو اکیلا دیکھ کر بولے۔ ”کیا نسرین بیٹی ابھی تک نہیں

سوچھی۔

”تب ہی مجھ سے نفرت ہے۔ اصل بات ہی کچھ اور ہے۔ چچا جان ہر وقت چپ چاپ رہتے ہیں۔ مجھ سے تو خدا واسطے کا میر ہے۔“ نسرین بولتی جا رہی تھی اور ناصر مجبوراً ”اٹھ آیا۔ اس نے وہاں سے آ جانا مناسب سمجھا۔“

اس کے باپ نے اسے وہ ہی کہانی یاد دلادی، جس کو وہ بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناصر باہر نکل آیا۔ لمبی سڑک پر وہ چلا رہا۔ سڑک جہاں جا رہی تھی، اس کے قدم بھی اسی طرف جا رہے تھے۔ گزرتی موٹروں کے ہارن اسے چونکا دیتے۔

کافی دور تک چلتے چلتے اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ قدرت نے اس کا ساتھ دیا وہ ایسی جگہ پہنچ گیا، جہاں لمبے لمبے درختوں کے پار دریا بہہ رہا تھا۔

دریا کے کنارے ایک ٹوٹی ہوئی کشتی پر وہ بیٹھ گیا۔ ٹوٹی ہوئی کشتی کو دیکھ کر اسے یہ احساس ہوا کہ یہ کشتی بھی میری طرح ہے۔ دریا کے کنارے پڑی حسرت سے دریا کی طرف دیکھ رہی ہے۔

”بھیک منگے۔“

اس کا دماغ انگاروں کی طرح دیکھنے لگا۔

”کاش، وہ بھیک منگوں ہی میں پیدا ہوتا۔“

اچانک اسے وہ کہانی یاد آ گئی جسے وہ بھول جانا چاہتا تھا، لیکن نہ بھول سکا۔

بانو، معصوم سی لڑکی۔

شیشی پکڑے روزانہ مخصوص وقت پر سرکاری ہسپتال کی طرف جایا کرتی اور کالج جاتے ہوئے ہر روز ناصر اسے دیکھتا۔

ایک دن ناصر جلدی میں تھا اور بانو دووائی لے کر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ دو شیشیاں تھیں۔ ناصر سائیکل پر تھا۔ نظریں بانو کی طرف تھیں۔ سائیکل اختیار سے نکل گیا اور بانو سے ٹکرا گیا۔ دووائی نکھر کر بنے گئی۔ شیشی ٹوٹ گئی اور شیشی کے ایک ٹکڑے نے بانو کے ہاتھ کو زخمی کر دیا۔

سرخ سرخ خون اس کی انگلی سے بہہ نکلا۔

ناصر نے معذرت کی، لیکن بانو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”کچھ تکلیف محسوس ہو رہی ہے کیا؟“ ناصر اسے روتے دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر کیوں رو رہی ہو؟“

”دوائی گر گئی۔ اب ڈاکٹر اور نہیں دے گا۔ اتنی مشکل سے لائی ہوں۔“

وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

”اتنی سی بات پر رو رہی ہو۔“ ناصر مسکرایا۔

”ایسا سارا دن کیا کھائیں گے۔“ وہ معصومیت سے بول اٹھی۔

”اچھا، ہم حسیں دوا لے دیتے ہیں۔“

ناصر نے اسے دوا لے کر دی۔ اسے گھر چھوڑنے گیا تو ان کی حالت پر اسے بڑا دکھ ہوا۔ بانو کا باپ ٹی بی کا مریض تھا۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جو پالش کیا کرتا اور اس گھر کا خرچ چلتا تھا۔

ناصر ہر روز ان کے ہاں جانے لگا۔ بوڑھے کے لئے دوا۔ چھوٹے کے لئے چیزیں، کھانے پینے کا خرچ۔ اور بانو کے لئے میٹھی میٹھی باتیں۔

بانو ہر روز اس کی راہ دیکھا کرتی۔

اس چھوٹے سے جمبو پڑے میں ناصر کو زندگی مل گئی۔ بانو سے وہ پیار کرنے لگا۔

اور بانو تو اس کی دیوانی تھی۔

اکبر علی کو کہیں سے اس بات کی بھگ پڑ گئی تھی۔ اس نے ناصر کو دھکایا لیکن ناصر باز نہ آیا۔

ناصر کی تعلیم ختم ہو گئی۔ تو اکبر علی نے ایک دم اس کی شادی کر دی وہ تریا۔ چلیا، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے واقعی بانو کو بھول جانا چاہا اور نسرین کا بننے کی کوشش کی۔ نسرین کا اس نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ لیکن نسرین تو۔



غریبوں کی ازل سے دشمن تھی۔ اور ناصر غریب تھا۔

آج خان صاحب نے اس کے دکھ کو کھینچ لیا تھا۔

وہ دریا کے کنارے بیٹھا ادھوری کمائی پر غور کرتا رہا اور پھر بے اختیار اس کے قدم بانو کے جھونپڑے کی طرف اٹھنے لگے۔ آج ڈیڑھ سال بعد وہ انہیں گلیوں میں جا رہا تھا۔

بدلو دار۔ سڑی گلیاں۔ جہاں امیر چلنے وقت ناک پر رومان رکھ لیتے ہیں۔ جھونپڑے کے آگے کچھ ننگے بچے پھیل رہے تھے۔ ناصر جھونپڑے سے آگے کھڑا ہو گیا۔ بچے اسے دیکھ کر یوں آگے پیسے ان کے ہاں کوئی عجیب انسان آگیا ہے۔

”وہ بابا کہاں گیا؟“ بچے ہنس پڑے۔

ایک ادھیز عمر انسان جھونپڑی سے نکل آیا۔

”کیا بات ہے بابو جی۔“

”یہاں پر جو پہلے رہتے تھے وہ لوگ کہاں گئے؟“

”وہ بابا تو مر گیا بابو جی۔“

”مر گیا؟“ ناصر کا دماغ جھنجھٹا گیا۔

”کب؟“

”ایک سال ہو گیا۔“

”اس کے بچے کہاں گئے؟“ ناصر نے دکھ سے پوچھا۔

”لڑکی دیوانی ہو گئی تھی۔ لڑکا اسے ساتھ لے کر چلا گیا۔“

ناصر چکرا کر گرنے ہی والا تھا کہ اس کا ایک شناسا جو بانو کا ہمسایہ تھا، اسے دیکھ کر بولا۔

”بہت انتظار کیا اس نے تمہارا بابو جی۔“

”میرا انتظار کرتی ہو گی۔“

”اور میں۔“

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

رات تک سڑکوں پر بے مقصد پھرتا رہا۔

آج اسے بانو بہت یاد آ رہی تھی۔

بانو۔ کہاں ہو گی وہ بے چاری۔ دیوانی ہو گئی۔“

اس کا ورد سکتے لگا۔

آدھی رات کو وہ گھر پہنچا۔ اپنے کمرے میں لیٹ کر وہ سوچنے لگا۔

اس نے کچھ نہیں کھایا۔ اور کسی نے اس کو پوچھا بھی نہیں۔ کھانا۔ کھانا۔

ذلیل کروا دیتا ہے۔

☆☆☆

صبح نرسن نے طعنوں سے پھر استقبال کیا۔

”مل آئے ہیں پرانے چاہنے والوں کو؟“

”نرسن۔ خدا کے لئے کچھ نہ کماؤ۔ نہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

ناصر چیخ اٹھا۔

”جی ہاں۔ پرانی یادیں تلخ ہیں؟ اس لئے برا لگتا ہے۔“ نرسن مسکرائی۔

ناصر نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہوا واقعی آپ کے ساتھ برا۔ اگر آپ شروع میں مجھے بتا دیتے تو میں

آپ کو آزاد کر دیتی۔“

ناصر خاموش رہا۔

نرسن ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کی ہنسی کے ساتھ ناصر کا دل تڑپ رہا

تھا۔

اکبر علی نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اور نرسن اس نے انکشاف پر حیران بھی

تھی اور خوش بھی۔

قاتل ہوں۔ قہر میں قاتل ہوں۔" ناصر کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"قاتل؟" قہریت سے چیخ اٹھا۔

"ہاں، قاتل۔ ایک معصوم لڑکی کی کتھاؤں کا قاتل۔ ایک بوڑھے باپ کی آس کا دشمن۔ اور ایک معصوم کے مستقبل کا قاتل۔"

ناصر کی نگاہوں میں بانو کی صورت بھر گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو ناصر؟"

"بانو پاگل ہو گئی قہر۔ ان کا باپ مر گیا۔ وہ بے سہارا ہو گئی۔"

"ہندیا بی نہ ہونا ناصر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" قہر نے اسے تسلی دی۔

ناصر سارا دن قہر کے ساتھ رہا۔ قہر اسے تسلی دیتا رہا۔ اس کے حالات سن کر اسے بڑا دکھ ہوا۔

رات گئے ناصر گھر آیا۔

آج قدرے وہ سنبھل گیا تھا۔

رات ویران تھی، چاند غائب تھا۔ اندھیرے ہیٹ ناک تھے وہ کھڑکی میں کھڑا گھور رہا تھا۔ نرسن کے کمرے میں ہلکی بھڑلاٹ جل رہی تھی۔ سرد کے لیے لیے درخت اندھیرے میں یوں معلوم ہو رہے تھے، جیسے کوئی دیو ہوں اور نجد ہو کر رہ گئے ہوں۔

ایسی پر ہول رات میں اسے پھر بانو یاد آئی۔

ایسی ہی کئی راتیں بانو اور اس نے میٹھی میٹھی باتیں کر کے گزار دی تھیں۔ ایسی راتوں سے بانو کو ڈر محسوس ہوا کرتا تھا۔ وہ ناصر کے کندھے پر ہاتھ رکھے دور تک چلی جاتی اور پھر جب وہ تھک جاتی تو اپنا سر ناصر کے سینے سے لگا دیا کرتی۔ ذرا سی آہٹ پر وہ چونک اٹھتی۔ بانو۔ لیے لیے بالوں والی بانو۔ جس کے سامنے میں ناصر سو جایا کرتا۔ پگلی۔ دیوانی۔

لوگ اسے پتھر مارتے ہوں گے۔ بچے اس کے پیچھے بھاگتے ہوں گے۔ لوگ اسے پگلی کہہ کر پکارتے ہوں گے۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگی ایسا پر ہول رات۔ جس سے وہ ڈرا کرتی تھی۔ اس رات میں وہ کہاں ہوگی۔ اسے ڈر لگتا ہوگا۔

اب وہ ناصر کو اور زیادہ ستا سکتی تھی۔

ناصر نے کپڑے وغیرہ تبدیل کئے اور باہر جانا ہی مناسب سمجھا۔ آج وہ قہر کے گھر کی جانب چل دیا۔ قہر اس کا پرانا دوست تھا۔

قہر کی بات آج اسے صحیح معلوم ہوئی۔

واقعی شادی ایک قید ہے۔ قہر نے اب تک شادی نہ کی تھی۔

قہر گھر پر ہی مل گیا۔

"آؤ یار تم تو بیوی کے غلام ہی بن کر رہ گئے۔"

ہر جگہ وہی باتیں تھیں۔ بیوی۔ غلام۔

وہی روح کو مجروح کرنے والی باتیں۔ اس کا دل چاہا یہاں سے بھاگ جائے۔ ایسی جگہ چلا جائے، جہاں کوئی اس کو یہ طعنہ نہ دے سکے، جہاں اس کو کوئی نہ جانتا ہو۔

جہاں پر وہ اپنے آپ کو بھول جائے۔

دنیا کو بھول جائے۔

قہر اسے گم سم دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا بات ہے ناصر؟" قہر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"قہر میں بہت پریشان ہوں۔" ناصر ادا اس تھا۔

"کیا خیریت تو ہے؟"

"مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ مجھے سکون نہیں ملتا۔ میرا دماغ ساتھ نہیں دے رہا۔ مجھے ڈر ہے دوست، کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں۔" ناصر ہندیا بی بن گیا۔

"مجھ سے بھی نہ کہو گے؟" قہر زبان رہ گیا۔

"چلو مجھے ایسی جگہ لے چلو۔ جہاں پر میں سب کچھ بھول جاؤں۔"

ناصر کا درد بہہ نکلا۔

"کیا بھالی سے لڑائی ہو گئی؟" قہر نے پوچھا۔

"بھالی وہ تو۔ میری دشمن ہے۔ اس سے میری بی بی کب تھی۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے، لیکن اب تو مجھے یہ احساس ہو گیا ہے کہ میں قاتل ہوں۔ میں

اور؟“ اکبر علی شکایت“ بولے۔

”اسندہ احتیاط کروں گا۔“ ناصر الجنا میں چاہتا تھا۔

”بیٹا کچھ خیال کرو۔ میرے لئے نہ سہی اپنی عزت کے لئے کہ تو تم نرسن سے بولتے نہیں۔ اس کی پروا نہیں کرتے۔ کیا وجہ ہے؟ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

ناصر چپ چاپ سنتا رہا۔

”بولو جواب دو۔ آخر کیوں تم نرسن سے دور بھاگتے ہو؟“ اکبر علی اصرار کر رہے تھے۔

”ایا جان کیا آپ نہیں چاہتے کہ میں زندگی کے چند دن پورے کر لوں۔“

”کیا مطلب؟“ اکبر علی حیرت سے بولے۔

”میری زندگی آپ نے خراب کر دی ہے“ ابا جان۔ سارا قصور آپ کا ہے۔ آپ نے مجھے سچ دیا ہے۔“ ناصر پٹ پڑا۔

”ناصر تم اپنے باپ سے بات کر رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔“ اکبر علی کے کہے رہ گئے۔

”جی ہاں، مجھے معلوم ہے کہ میں اپنے والد بزرگوار سے باتیں کر رہا ہوں جن کا میں ہی بیٹا ہوں۔ جنہوں نے مجھے ماں بن کر پالا ہے۔ جنہوں نے ایک ادھنی اور اچھی جگہ پر میرا سودا کیا ہے۔“

”ناصر“ اکبر علی چیخ کر بولے۔

”میری زبان نہ روکے ابا جان ذرا آج میں آپ کو بتا دوں کہ ادھنی جگہ مجھے کتنی پسند ہے۔“

”ناصر“ اکبر علی کا ایک بھروسہ ملائچہ ناصر کے گال پر پڑا۔

ناصر نے ایک عجیب سی نظر باپ پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔ اسے باپ کے ملائچے کا کوئی دھک نہ ہوا بلکہ کسی حد تک اس کا دل غصٹک محسوس کر رہا تھا۔ سکون محسوس کر رہا تھا۔ کہ اس نے اپنے باپ کو کچھ باتیں سنا دیں۔

قراس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ قرے کے ساتھ فلم دیکھنے چلا گیا۔ کسی حد تک

نہیں نہیں کیوں کر وہ دیوانی ہے۔ بگلی ہے۔ اسے کیا معلوم۔

سگریٹ اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ شاید اس کا دل بھی جل رہا تھا اور اس کے دل جلنے کا دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔

اچانک اس کے کانوں میں بانسری کی آواز گونجی۔

بانسری کی سرلی آواز۔ جس میں درد تھا، سوز تھا۔ نہ جانے کون دل جلا ہے جس کو آدھی رات کو بھی چین نہیں۔ ٹھیک ہے۔ دل جلوں کو چین کہاں، وہ بے چارہ بھی اپنا غم اس آواز میں مدغم کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

ہوا میں خنکی آگئی تھی۔

دور کس دو بجے کا ٹھنڈ ہوا۔ دو بج گئے۔ رات بیت رہی ہے۔ کئی راتیں بیت جائیں گئیں۔

کیا میرا درد رک جاتے گا۔ کیا میں آزاد ہو جاؤں گا۔ کیا مجھے چین نصیب ہوگا۔

یہ سوچتے سوچتے وہ بہتر آگرا۔

وہ ماہ بیت گئے لیکن نرسن کے رویے میں فرق نہ آیا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔

اکبر علی بھی ناصر سے بات نہ کرتے تھے لیکن آخر باپ کا دل تھا۔ ناصر کو دیکھ کر ان کا دل بیچ گیا۔ ناصر کی صحت بہت گرمی تھی۔ کہاں وہ کڑیل جوان۔ اور کہاں۔ زرد زرد چہرے والا انسان۔

”ناصر“ اکبر علی نے ناصر کو باہر جاتے ہوئے دیکھ کر آواز دی۔

”جی فرمائیے۔ ناصر مڑ گیا۔

”کہاں رہتے ہو آج کل؟“ اکبر علی کا لہجہ نرم تھا۔

”میں۔ میں پر۔ میں کہاں جا سکتا ہوں بھلا۔“ ناصر پر اصرار لہجے میں مکر دیا۔

”میں تو ہمیں بت کم دیکھتا ہوں۔ اکثر رات کافی ہو جاتی ہے اور تم آتے

نہ آیا۔

اکبر علی دل میں فکر لئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

”نہ جانے کہاں گیا؟“

”نہ جانے واپس آئے گا یا نہیں؟“

”نہ جانے کہاں ہوگا؟“

انہی خیالوں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔

○

وہ سکون محسوس کر رہا تھا۔

کتنے دن ہو گئے تھے، نرسن سے اس نے بات تک نہ کی تھی۔ اس فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ بالکل نرسن سے نہیں بولے گا۔

”ناصر“ اس کے خیالوں کو قوت دیا۔

”چلو چند دن کے لئے کراچی چلیں۔“

”کراچی۔ نہیں یار میں کیا کروں گا جا کر۔“

”چلو یار اس قدر ہنگامہ پرور ضرر ہے۔ انسان ہنگاموں میں گم ہو جاتا ہے۔

وہاں پر ایک نئی دنیا ہے۔“

”نہیں، قمر میں نہیں جا سکوں گا۔“

”اچھا تو پھر اس رہنا چھوڑ دو۔ بھابی سے صلح کر لو میں دیکھ رہا ہوں کہ

بھابی سے لڑ کر تم خوش نہیں رہ سکتے۔“ قر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم غلطی پر ہو قمر“ ناصر ہنس کر بولا۔

”بھابی سے صلح کر لو پھر؟“

”ناممکن ہے۔“

”آخر کیوں؟“

”اس کا جواب میں نہیں دینا چاہتا۔“

مجبوراً ”قمر چپ ہو گیا۔

رات ناصر قمر کے گھر رہا۔

اکبر علی نے رات کو ناصر کا کافی انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا۔ تب اکبر علی کو

بڑی فکر ہوئی۔ ”ناصر کہیں چلا نہ جائے۔“ رات گئے تک وہ برآمدے میں ٹھیلے

رہے۔

اس بات کو انہوں نے شدت سے محسوس کیا کہ نرسن کو ناصر کی بالکل پروا

نہیں۔ اسے ذرہ بھر بھی احساس نہیں تھا کہ ناصر رات کو کیوں نہیں آیا، بلکہ وہ

قلم دیکھ کر ہنسی ہوئی رات بارہ بجے آئی اور آکر سو گئی۔

اکبر علی رات کے ڈیڑھ بجے تک انتظار کرتے رہے لیکن ناصر کو نہ آتا تھا

”چچا جان مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ اس میں میری توہین ہے۔“  
 ”نہیں بچی اس میں توہین کس بات کی ہے۔ وہ تمہارا خاوند ہے۔ تمہارا  
 اس پر حق ہے۔“ اکبر علی نسرین کو سمجھانا چاہتے تھے۔  
 ”میں ایسا نہیں کروں گی۔“ نسرین اپنے فیصلے پر اٹل تھی۔  
 ”چلو بچی میرے خیال میں وہ قمر کے پاس ہو گا۔ چلو تم خود چل کر اسے لے  
 آؤ۔“

”نہیں چچا جان“

”چلو بچی خد نہ کرو۔ چلو ورنہ یہ گھر برباد ہو جائے گا۔“  
 ”بربادی کا مجھے ذرا بھی غم نہیں۔“ نسرین فاتحانہ بولی۔  
 ”نہیں بچی ایسا نہ کہو۔ چلو۔“  
 اکبر علی دیر تک نسرین کو سمجھاتے رہے۔ نسرین بھی الجھتی رہی آخر اکبر  
 علی نے اسے متا لیا اور وہ کار لے کر قمر کے گھر کی طرف چلی گئی۔  
 ناصر اور قمر رمدے میں بیٹھے تھے۔ نسرین کو دیکھ کر ناصر حیران رہ گیا اور  
 قمر اس کے استقبال کے لئے اٹھا۔

”آئیے بھائی صاحبہ آج ہمارے نصیب عروج پر ہیں کہ بھائی ہمارے گھر چل  
 کر آئی ہیں۔“  
 ”آپ تو کبھی بلائے نہیں‘ خود میں آئی ہوں۔“ نسرین ہنس پڑی۔  
 ”آئیے بیٹھے قمر نے کرسی آگے کی۔“

ناصر خاموش بیٹھا تھا۔  
 نسرین نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ رات گھر نہیں آئے۔“  
 ”یوہی۔“ اس نے کھویا کھویا سا جواب دیا۔  
 ”یوہی کیوں۔ چلے گھر۔ ہم بوسے ہی پریشان ہوئے۔“  
 ”پریشان میرے لئے؟“ وہ بڑی غناک سی ہنسی دیا۔  
 قمر اندر چلا گیا تھا۔

”یہ آپ بار بار روٹھ کیوں جاتے ہیں۔“ نسرین اس کا مذاق اڑا رہی



اکبر علی نے صبح اٹھ کر پہلے ناصر کے کمرے میں جھانکا۔ بسترچوں کا توں پڑا  
 اس بات کی چٹلی کھا رہا تھا کہ یہاں کوئی بیٹھا تک نہیں۔  
 اکبر علی ناشتہ پر آئے۔ نسرین موجود تھی۔  
 ”چلو چچا جان“  
 اکبر علی اپنی کرسی پر بیٹھے بولے۔ ”ناصر رات گھر نہیں آیا۔“  
 ”جی۔ کسی دوست کے ہاں ٹھہر گئے ہوں گے۔“ نسرین توس پر کھنکھاتے  
 ہوئے بولی۔

”مگر وہ پہلے اس طرح کبھی گیا۔“ اکبر علی تشویش سے بولے۔  
 ہاں پہلے رہے تو نہیں۔ لیکن اس گھر میں ان کے لئے کیا دلچسپی ہے۔ بیوی  
 کو تو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔“ نسرین جیسے اس انتظار میں تھی کہ وہ باتوں کو اکبر  
 علی کے گوش گزار کرے۔

اکبر علی کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ سارا قصور انہیں کا  
 تھا۔ ناصر ہمیشہ انہیں کہا کرتا کہ وہ امیر گھرانے میں شادی نہیں کرے گا، اکبر علی  
 نے اس کے ساتھ دُروستی کی تھی۔ ”بٹی تم خود اسے سمجھاؤ۔“ اکبر علی کے پاس  
 آخری ہتھیار یہی تھا۔  
 ”میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھیں گے؟“

”کیوں نہیں تم اس کی بیوی ہو۔ وہ نادان ہے تم عقل سے کام لو۔ ایک  
 مرتبہ اس کا دل جیت لو۔“ اکبر علی اپنی بزرگی تک بھول گئے تھے۔

تھی۔

”میں روٹھا تو نہیں۔ یونہی رات قرے اسرار کیا تو بیس رک گیا۔“  
”اچھا تو چلے“

”میں ابھی آنے والا تھا۔“  
”چلے پھر۔“

”قر آ جائے پھر چلتے ہیں“

قر آ گیا اس کے پیچھے ملازم چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔

”میں چائے پی کر آئی تھی۔“ نسرین نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں ایک پیالی اور سسی۔“

قرے نسرین کو پیالی بنا کر دی۔ ناصر کو بھی چائے دی اور خود بھی ایک پیالی لے لی۔

چائے پی کر نسرین اٹھ کھڑی ہوئی۔

ناصر بھی اٹھا۔ قرے مسکرا کر کہا۔ ”چل دیے بندہ نواز“

ناصر بھی چل دیا۔

کار نسرین ڈرائیو کر رہی تھی اور ناصر کسی مجرم کی طرح اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

قیدی پکڑا گیا۔ قیدی واپس جا رہا تھا۔

”تم کو واپس جانے کا کوئی دکھ تو نہیں؟“ نسرین نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”قیدی جو ہوا۔ قیدی کو دکھ ہو یا سکھ۔ اس کا سوال ہی بیکار ہوا۔“

”اچھا تو جاب قیدی ہیں لیکن کس کے؟“

”دولت کا قیدی۔“

نسرین کل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”باتیں بڑی مزیدار ہیں آپ کی۔“

ناصر کو نسرین کی ہنسی اس قدر بے لوث لگی کہ ایک بار پھر وہ نسرین پر بیاہ

کی نظر ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ نسرین۔ جو اس کی بیوی ہے۔ نسرین مسکراتی ہوئی ہار ڈرائیو کر رہی تھی۔ ناصر بھی ہنس دیا۔

گلے شکوے دور ہو گئے۔ ایک بار وہ پھر نسرین کی آنکھوں میں زندگی کا نئس دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

”تمہیں میرے جانے کا دکھ ہوا تھا؟“ ناصر بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

”جی ہاں قیدی بھاگ جانے تو دکھ کیسے نہیں ہوتا۔“ نسرین ہنس رہی تھی۔

”اب قیدی کبھی نہیں بھاگے گا۔“ ناصر مسکرایا۔

”شکریہ“

کار کو کھلی کے سامنے رکی۔

اکبر علی اب تک گھرتے۔ ناصر نے ان کی پریشانی بھانپ لی۔ اسے اپنے کئے پر دکھ ہوا۔

”ابا جان مجھے معاف کر دیجئے۔“

”میرے بیٹے“ اکبر علی نے ناصر کو سینے سے لگایا۔

ناصر نسرین کے کمرے میں آ گیا اور سوچنے لگا۔

”کاش“ نسرین سنبھل جائے۔ کاش نسرین سنبھل جائے۔

☆☆☆

دو ماہ بیت گئے۔

نسرین اپنی عادت چھوڑ نہیں سکتی تھی لیکن گزارہ ہو رہا تھا۔ صرف ایک ماہ ان پر جس نے اپنا من مار لیا تھا۔ اپنی روح کو کچل دیا۔ خود کو چتر بنا لیا تھا۔

انسان تھا ناصر۔

نسرین نے جو کیا‘ ناصر نے برداشت کیا۔ گو خود وہ قابلِ رحم تھا۔ لیکن وہ

خود ہی اسے بھوک محسوس ہوئی۔ وہ لان کی جانب نہ جانا چاہتا تھا۔  
 بچن روم کی جانب اس نے خانسماں سے کھانا مانگا۔  
 ”صاحب وہاں چلے“

”نہیں“ مجھے کھانا میرے کمرے میں چاہیے۔“  
 ”چھا صاحب“

ناصر واپس آ رہا تھا کہ اسے غزالہ نے دیکھ لیا۔ ”ناصر صاحب ادھر آئیے۔“

ناصر کو اخلاقا وہاں جانا پڑا۔

غزالہ نے طنزیہ تعارف کرایا۔

”سٹر ناصر صاحب، نرسن کے شوہر“

”یہ نرسن کے شوہر“ لڑکیوں نے ایک ساتھ حیرت سے کہا۔

”چ تو تھا۔ کہاں نرسن۔ خوبصورت، جوان، شائش اور کہاں ایک بکھرے ہالوں والا کھویا کھویا سا نوجوان۔ جس کے کپڑوں پر بے شمار سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ جس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ جس کا رنگ زرد تھا۔“

نرسن بھی لڑکیوں میں شامل تھی۔

ناصر معذرت کے چند الفاظ کہہ کر واپس آگیا، لیکن کمرے میں آکر اسے بانو پھر آج شدت سے یاد آگئی۔

کیا بانو مجھے اپنے جیسا کر دے گی؟ میں بھی دیوانہ ہو جاؤں گا۔ میں بھی پاگل ہو جاؤں گا؟ بانو۔ بے چاری بچی۔ لوگ اسے پتھر مارتے ہوں گے۔ اس کی حرکتوں پر ہنستے ہوں گے اور وہی بانو ناصر کی زندگی تھی۔

ہر روز ناصر کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ اس کے لانے ہوئے تحفوں کو سینے سے لگایا کرتی تھی۔ اس کے لئے اچھی اچھی چیزیں پکایا کرتی تھی۔

وہ بانو جانے کہاں ہوگی؟

ناصر بے قرار ہو گیا اور باہر نکل آیا کوٹھی میں قلمتے روشن تھے ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔

مزارہ کر رہا تھا۔

آج نرسن کا موڈ زیادہ خراب تھا۔

لیڈی ڈاکٹر نے اسے پیٹا دیا تھا کہ وہ سات ماہ بعد ماں بن جائے گی۔ کوئی اور بیوی ہوتی تو شوہر کو شرماتے ہوئے خوشی سے یہ یہ نظام سناتی۔ لیکن نرسن تو ان باتوں سے نفرت کرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ناصر کے بچوں کی ماں بنے۔

اس کے خیال میں بچے زندگی تباہ کر دیتے۔

ناصر نہ خوش تھا نہ اداس۔ اگر خوشی تھی تو اکبر علی کو تھی۔ اب تمام جائیداد اس کے وارث کو ملے گی۔

نرسن تو یہی کوشش کر رہی تھی کہ بچہ ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے۔ لیکن اکبر علی آڑے آئے۔ انہوں نے نرسن کے باپ کو خط لکھ دیا تھا اور وہاں سے نرسن کو اس بات پر پھینکار آئی تھی۔

دوسرے لیڈی ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ اس کی اپنی جان کا بھی خطرہ ہے۔ تب کہیں جا کر وہ۔ لیکن ان تمام باتوں کا غصہ ناصر بے چارے پر نکلا۔

نرسن ناصر سے بیزار ہو گئی اور اچھی جھڑپیں ناصر سے ہونے لگیں ناصر عاجز آگیا۔ اس کے تمام فیصلے نرسن کے طعنوں نے پاش پاش کر دیئے۔ اب تو وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا تھا۔ قہر بھی کراچی چلا گیا تھا۔ ناصر پریشان ہو گیا تھا ویران تھا۔ اس کے دل کے داغ بھر رہے ہو گئے۔ جن پر نرسن روزانہ نمک پاشی کرتی رہی۔ زخم رستے لگے اور ناصر کی زندگی بھی سنسنے لگی۔ وہ اکثر راتوں کو کسی بچ پر بیٹھا رہتا۔ کئی مرتبہ وہ وہیں رات گزار دیتا۔

آج جب وہ گھر گیا تو نرسن کی سیلیاں آئی ہوئی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں نفرتی قہقہے گونج رہے تھے۔

وہ آکر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ رات کھانا بھی دیں کھایا جا رہا تھا۔

اسے پتہ نہیں تھا کہ کس خوشی میں یہ ڈر ہے۔

اسے کسی نے نہ پوچھا۔

”اوہ۔ سکون“ تب تو بابو جی آپ میرے ساتھی ہیں۔“ اجنبی ایک مکار سی  
نی ہنس۔

”کیا مطلب؟“ ناصر سوالیہ بن گیا۔

”میں بڑا دکھی ہوں بابو جی۔ مجھے کہیں بھی سکون نہیں ملا۔ اگر میں نے  
زندگی۔ تو ایسے سب کچھ کھو جانے میں زندگی پالی۔

”آپ میرے ساتھ آئیے میں آپ کو اپنی داستان سناؤں۔“ اجنبی اٹھتے  
اٹے بولا۔

ناصر بے اختیار اس کے ساتھ ہو لیا۔ اجنبی اسے ایک بار میں لے گیا جہاں  
ہام آپس میں ککرا رہے تھے۔ لوگ بدست تھے۔

ناصر کو وہ الفاظ یاد آگئے۔ دکھی لوگ کبھی کبھی شراب کا سہارا لیتے ہیں۔  
”شراب“

وہ ایک میز پر بیٹھ گئے۔ اجنبی نے ناصر سے کہا۔ ”میں نے زندگی اس جگہ  
پالی ہے۔ میں یہاں آکر اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں اور پھر دنیا کے غم مجھے  
پھونک جاتے ہیں۔

اجنبی نے بیرے کو بلایا۔ ”ایک بوتل دے سکی۔“

بیرا سوڈا اور دسکی لے آیا۔ اجنبی نے پیگ بھرے اور ایک ناصر کے  
ہاتھ میں دے دیا۔

”ناصر نے جام میں اپنا عکس دیکھا۔ اور زندگی پانے کے لئے جام غماغت  
ہنسا گیا۔

وہ چٹا گیا۔ مدہوش ہو گیا۔

اجنبی رات گئے اسے باہر لے آیا۔ گھر کا پتہ اس نے ناصر سے پوچھا۔ تو  
ناصر کو بھی کانبرتا کر چپ ہو گیا۔

ڈرائیور ناصر کو پہلے بھی ایک مرتبہ کوٹھی لے گیا تھا۔ جان گیا۔

ناصر کو کوٹھی میں اتار کر اجنبی ٹیکسی پر چلا گیا۔

اس کا کام ہی یہی تھا۔ وہ اپنا خرچ پورا کرتا ہی اس دھندے سے تھا اور

وہ باہر سڑک پر چلتا رہا۔

دور۔ کہیں دور۔ دور۔

لیکن۔ اس کی منزل کہیں بھی نہ تھی۔

آخر۔ اسے لوٹ کر پراس کوٹھی میں واپس آنا پڑا۔  
قیدی جو ٹھہرا۔

☆☆☆

ناصر ایک بچہ پر بیٹھا باغ میں کھیلنے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔

بچوں کی آیا ایک طرف بیٹھی تھی اور ننھے ننھے بچے کھیل رہے تھے۔

شام سرک رہی تھی۔ شفق کی رانی نے آسمان کو لال کر رکھا تھا۔ شام کچھ

ٹھنک بخش رہی تھی کیونکہ دن بے حد گرم گزرا تھا۔ ٹھنڈی ہوا، چنبیلی کی

خوشبو سے مک رہی تھی۔

ناصر کے ساتھ ہی ایک شخص آکر بیٹھ گیا۔

”بابو جی ماہی ہوگی آپ کے پاس؟“

”ہی ہاں۔“ ناصر نے ماہی نکال کر دی۔

”میں آپ کو ہر روز اس جگہ دیکھتا ہوں۔ کیا کوئی چیز تم ہوگئی ہے آپ

کی“ اجنبی سلسلہ گفتگو کا آغاز کر رہا تھا۔

”ہاں“ میری ایک چیز تم ہوگئی۔“ ناصر کھویا کھویا سا بولا۔

”کچھ سکتا ہوں۔ وہ کون سی چیز ہے جو آپ کو یہاں لے آتی ہے۔“

اجنبی نے سوال کیا۔

”سکون۔“ میرا سکون کھو گیا ہے۔ اسی کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔“ ناصر

نے اس لیے میں جواب دیا۔



آج ناصر کا پورا بڑا اس کے پاس تھا۔ ناصر گرتا پڑتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے کسی نے نہ دیکھا۔ وہ جہاں پڑا تھا، وہیں سو گیا۔ اس کو اپنی خبر نہ تھی اور پھر اس اجنبی نے اسے شراب دکھا دی۔ غم غلط کرنے کے لئے۔

اب وہ خود ہی بار چلا جاتا اور دیر تک غم غلط کرنے کا علاج کرتا رہتا۔ گھر میں بھی اس کے پاس بوتلیں رہتے لگیں۔ شراب اسے ایک نئی زندگی دے رہی تھی۔ اب تو اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی وقت بھی ہوش میں نہ آئے۔

☆☆☆

بار کی رنگینیاں اسے نئی زندگی دے رہی تھیں۔

پھر اسے کئی ساتھی مل گئے۔ اس کو برباد کرنے کے لئے کئی دوست آ موجود ہوئے۔ دوستوں نے غم غلط کرنے کا ایک نیا راستہ اسے دکھایا۔ وہ راستہ تھا۔ بازار۔ کا۔

اس بازار کا جہاں حیات چلتی پھرتی ہے۔ جہاں جوائیاں بک جاتی ہیں۔ جہاں پر دیوانے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی فریب کا نام ہے۔ مگھیری زلفوں کے سائے انہیں غم سے نجات دلائیں گے وہ ان میں کھو کر رہ جائیں گے۔

ناصر بھی دوستوں کے ساتھ اسی بازار میں جا بیٹھا۔ جہاں گھنگھروں کی جھنکار کے ساتھ سکوں کی جھنکار بھی ایک ہی آواز پیدا کر رہی تھی۔ یہ آواز کئی گھر اجاڑ رہی تھی۔ کئی دل ویران ہو رہے تھے۔ کئی بیویاں باورچی خانے میں اپنے شوہروں کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور خاوند گھنگھروں کی جھنکار پر سکوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

زندگی نامیام خیالوں کا مجموعہ ہے۔ زندگی کے ہر پھیر واقعی اچھے ہوئے

ہیں۔

میں تو اتنی وفا ہے کہ حد سے زیادہ اور کہیں بیوی ایسی ہے کہ خاوند کی زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہے اور پھر مجبوراً ”وہ ان راستوں کی جانب چلن دیتے ہیں۔“

ناصر پہلی مرتبہ اس جگہ آیا تھا۔

دیر تک وہ گانا سنتے رہے۔ لیکن ناصر کو سکون یہاں بھی نہ ملا۔

ایک انار۔ سو پتھر۔

رات بارہ بجے کے قریب ناصر اٹھ آیا۔ گھر وہ جانا نہ چاہتا تھا لیکن آخر کہاں جاتا۔ مجبوراً ”جانا ہی پڑا۔“

اکبر علی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”ناصر؟“

”جی فرمائیے“

”کہاں رہتے ہو اتنی رات تک۔“ اکبر علی تنک آگئے تھے۔

”دوستوں کے ساتھ۔“ ناصر اب بالکل نہ ڈرتا تھا۔

”آخر تم کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو؟“

”آپ کو غلط فہمی ہے۔ میں تو دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔“ ناصر اب جھوٹ بھی بولنے لگا تھا۔

”مجھے معلوم ہے تم کون سا کھیل کھیل رہے ہو۔“

ابا جان کھیل تو فطرت نے ہر انسان کی زندگی کا جزو بنا دیا ہے۔“

یہ ایک کھیل ہے، کھیل میں ہی اپنا کام کر لیجئے۔“

”ابا دیکھئے نا۔ ہر ایک انسان کھیلتا ہے۔ کوئی تو زندگی کا کھیل، دولت کا کھیل اور کئی کھیل ایسے ہیں۔“ ناصر بولتا جا رہا تھا۔

”ناصر“ اکبر علی نے اسے ٹوکا۔ ”تم بڑھتے جا رہے ہو۔ تم کو خیال ہونا

چاہئے۔“

”جی ہاں۔ خیال ہونا چاہئے۔ واقعی۔ آپ نے میرا خیال کیا۔“

”تم سر پھرے ہو۔“ اکبر علی نے کہا انہیں معلوم تھا کہ ناصر اب بچت

واقعی وہ نرسن کی دولت اڑا رہا تھا۔ وہ شراب پیتا تھا اور پائل کی بھنکار پر ہزاروں روپے بچاؤ کر رہا تھا۔  
 ”اگر اتنا ہی شوق ہے عیاشی کا تو خود کما لے۔“ نرسن نے ایک اور تہرہ پھوڑا۔

ناصر چپ چاپ گیٹ کی طرف گھور رہا تھا۔ اس وقت اس کی غیرت کو ایک نہیں سی گئی۔ نرسن سچ تو کہہ رہی تھی۔ واقعی اگر اسے یوں عیاشی کرنا ہے تو ذرا کما لے۔ اس کے چہرے کی دیکیں پھول گئیں۔ جذبات میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔  
 نرسن بڑبڑا رہی تھی۔

”میری قسمت پھوٹ گئی۔ آپ کو فخر کرنا چاہئے۔ الٹا آپ ناراض ہیں۔ سچ ہے جس کو کبھی کچھ نہ ملے اور پھر ایک اتنی دولت کا مالک ہو جائے اس کی آنکھیں تو خواہ خواہ چندھیا جائیں گی۔

”نرسن“ ناصر سچ کر بولا۔  
 نرسن کوئی ڈرنے والی تو نہ تھی۔ ”مگرج کر بولی۔ آپ رعب کس کو دیتے ہیں۔ براہ کرم میری دولت تباہ کرنے کا خیال چھوڑ دیں۔ آوارگیوں کے لئے نہیں۔“

اور اگلے ہی لمحے ناصر نے ایک بھرپور طمانچہ نرسن کے گل پر بڑ دیا۔ طمانچہ کیا تھا۔ نرسن غصے سے دیوانی ہو گئی۔ سچ سچ کر اس نے گھر اکٹھا کر لیا۔ اکبر علی دوڑتے ہوئے آئے۔ نرسن بری طرح رو رہی تھی اور ناصر بے تذبذب کی حالت میں مثل رہا تھا۔ اکبر علی حیران تھے کہ کیا کریں۔  
 ”ناصر تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔“ وہ غصے سے بولے۔

”پاگل ہو جاؤں گا۔“ ناصر بھی غصے میں تھا۔  
 ”میں آج ہی ابی جان کے پاس جاؤں گی۔“ نرسن روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”میں اب نہیں ٹھہر سکتی۔“  
 اور اس فیصلے سے اکبر علی لرز گئے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ کہیں کا نہیں رہے

شروع کر دے گا۔

”شکریہ میں یہی سنا چاہتا تھا۔“ ناصر مسکرا دیا۔

اکبر علی عجیب شش و پنج میں تھا۔ ناصر اب باقی ہو گیا ہے۔

وہ نرسن کے طعنوں کا جواب بھی ترکی بہ ترکی دیتا۔ سب گھروالے اس کی اس روش پر حیرت زدہ تھے۔ نرسن حیران تھی۔  
 اکبر علی فکر مند تھے اور ناصر خوش تھا کہ وہ ان کی باتوں کا جواب دیتا کیجہ گیا ہے۔  
 واقعی اسے زندگی مل رہی تھی۔ نئی زندگی۔

☆☆☆

دن خوب چمکیا تھا۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیل گئی تھی۔ کئی دن بارش کے بعد دھوپ نکلی تھی۔ موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔  
 ناصر نانتے سے فارغ ہو کر برآمدے میں آ بیٹھا۔ پریشان حال ناصر جس کو ذرا بھی سکون نہ تھا۔ جس کے ذہن میں ایک کھلبلی سی مچنی تھی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور سامنے چلتی ہوئی سڑک مل کھائی ہوئی کہاں جا رہی تھی۔ نرسن اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے کی طرف آئی اور ناصر کو بیٹھا دیکھ کر وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”آپ کہاں رہتے ہیں سارا دن؟“ نرسن کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔  
 ”جہاں جی چاہا۔ آپ کو مطلب؟“ ناصر نے زندگی کا اثر دکھا رہا تھا۔  
 ”مجھے مطلب کیوں نہیں۔ میری دولت آپ تباہ کر رہے ہیں۔“

نرسن نے بھرپور وار کیا۔  
 ناصر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس کا ضمیر چیخ اٹھا اور کانوں میں سیسہ پھیلنے لگا۔

گاہ۔ وہ فوراً "نرسن کی طرف بڑھا۔" یہ خطی ہے بیٹا اس کا خیال نہ کرو۔ میں اسے سمجھا لوں گا۔" "لیکن نرسن نہ مان رہی تھی۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی اور ناصر بے بسی سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

آج اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے گا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ اپنے کپڑے بکس میں رکھنے لگا، لیکن اچانک خیال آیا یہ کپڑے بھی نرسن کی دولت کے ہیں۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔

وہ ایک عجیب سی خسی ہنستا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے قدم اسٹیشن کی جانب تھے۔

☆☆☆

گاڑی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔

لاہور پہنچے رہ گیا تھا اور ناصر ایک سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ یکایک ڈبے میں کھلبلی مچ گئی۔ ناصر نے چونک کر دیکھا۔ لوگ ایک لڑکے کو پکڑے ہوئے بیٹھ رہے تھے۔ ناصر نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"چور ہے جی۔ اس شریف آدمی کی جیب کاٹ لی۔"

ناصر نے اٹھ کر دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ لڑکا بانو کا بھائی وحید تھا۔

"وحید تم؟" ناصر لوگوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔

"بابو جی،" وہ ناصر سے لپٹ گیا۔

لوگ ناصر کو جرت سے دیکھ رہے تھے۔ "اس نے میری جیب کاٹی ہے۔"

یہ چور ہے، اسے ہمارے حوالے کر دو۔" کئی آوازیں گونج اٹھیں۔

نصرے نصرے، کیوں وحید تم نے ایسا کیا ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

وحید کی آنکھوں میں مذمت کے آنسو تھے۔ "ان کا بڑا واپس کر دو۔" وحید نے قیض کے اندر سے ہوا ناصر کو دے دیا۔

ناصر ہوا دے کر بولا۔ "میں خود اسے سزا دوں گا۔" لوگ ہلکے ہوئے تھے۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں لیکن ناصر وحید لے لے کر اگلے اسٹیشن پر اتر گیا۔ وحید کو پا کر اسے نہ جانے کیوں ایک انجانی سی ناشی ہوئی۔ وہ بے قرار تھا کہ وحید سے۔ بانو کے بارے میں پوچھتے۔

بھیز کو چیرتا ہوا وہ ایک بیچ کی طرف بڑھا۔ "وحید"

"جی۔" وہ سما ہوا تھا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"لاہور میں۔" کس جگہ؟ میں تو تمہیں تلاش کر کے ہار گیا۔

"میرا کوئی خاص ٹھکانہ نہیں ہے بابو جی،" وحید ورد سے بولا۔

"کیا مطلب؟ کیا بانو تمہارے ساتھ نہیں؟" ناصر کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"بانو۔" وحید کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ "وہ کھو گئی بابو جی میں نے اسے کتنا تلاش کیا، نہیں ملی۔"

"اوہ۔" ناصر کی نظریں جبک گئیں جیسے وہ وحید سے شرمندہ ہو۔ دل پر

ایک بوجھ سا تھا۔ دماغ ماؤف سا ہو رہا ہے۔

"بابو جی وہ پاگل ہو گئی۔ میں اسے لے کر حیدر آباد آیا لیکن اسٹیشن سے وہ بھاگ گئی۔ میں اسے پکڑنے گیا لیکن وہ میرے ہاتھ نہ آئی۔ نہ جانے کہاں نہپ گئی۔ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ بابو جی۔ میں تو تھک گیا ہوں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔" وحید کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

ناصر چپ چاپ لائن کی طرف دیکھ رہا تھا جو ریگتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ جہاں ابھی ابھی گاڑی کھڑی تھی لیکن اب وہ گاڑی دور جا چکی تھی۔

”وحید“ اس نے چونک کر کہا۔

”جی، بابو جی“

”تم نے چوری کیوں کی؟“ جیسے ناصر کو ایک دم ہی خیال آگیا۔

”میں مجبور ہوں بابو جی۔“ وحید ہلکا گیا۔

”تم محنت بھی کر سکتے تھے۔“ ناصر جیسے بہت دور سے بول رہا تھا۔

”بابو جی یہ زمین ہم پر تنگ ہو سکتی ہے۔ مجھے کہیں محنت نہ ملے۔ میں نے

مزدوری کرنی چاہی لیکن مجھے دھکے دئے گئے۔ پھر میں کیا کرتا۔“

”بہر حال تم چوری کرنا چھوڑ دو۔ میں تمہارا خرچ تمہیں پہنچا دیا کروں گا مگر

تم چوری نہ کرنا۔“

دوسری گاڑی آرہی تھی شاید۔ اسٹیشن پر ایک بچل سی بچ سنی تھ تھی۔

”چلو لاہور چلیں۔“ ناصر اچانک بدلا۔

”چلیں“ وحید نے جواب دیا۔

مگر۔ ناصر رک سا گیا۔ وہ تو وہاں سے تنگ آ کر بھاگا ہے۔ کیا پھر وہیں

جائے۔ نہیں نہیں۔ وہ نہیں جائے گا۔

”نہیں نہیں۔ میں لاہور نہیں جاؤ گا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”کیوں بابو جی؟“ وحید اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک گاڑی ایک شہر کے ساتھ دندناتی ہوئی اسٹیشن میں داخل ہوئی۔

”یہ گاڑی کہاں جائے گی، وحید“ وہ پریشانی سے بولا۔

”یہ تو لاہور جاتی ہے بابو جی۔“ وحید نے جواب دیا۔

”لاہور۔ تو چلو پھر لاہور چلیں۔“ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

”چلیے۔“ وحید بھی حیران تھا۔

اور ایک بار پھر قیدی واپس جا رہا تھا۔

لاہور پہنچ کر ناصر نے وحید سے پوچھا۔

”تم کہاں جاؤ گے وحید؟“

”میں بابو جی۔ وہاں۔ کہیں بھی چلا جاؤں گا۔“ وحید بوکھلا گیا۔

”یہ لوہ۔“ ناصر دس روپے کا ایک نوٹ وحید کو تمبا دیا۔ ”پھر مجھے ملنا۔“

وحید کی آنکھیں چمک اٹھیں اور نوٹ اپنی میلی واسٹ کی جیب میں چھپانے

لگا۔

”اچھا وحید میں جا رہا ہوں۔“ ناصر ایک ٹیکسی کی جانب بڑھا۔

اس نے پھر گھر کا ارادہ کیا۔ ٹیکسی کو ٹھہری کے باہر رکی۔ ناصر یوں گھر میں

داخل ہوا۔ جیسے کوئی چور ہو۔ وہ اپنے کمرے کی طرف گیا۔ نرسن اپنے کمرے

میں سگٹنا رہی تھی اور اکبر علی شاید اب تک گھر نہ لوٹے تھے۔ کمرہ اسی طرح

کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ کپڑے پڑے تھے۔

ناصر نڈھال سا ہو کر پٹنگ پر گر پڑا۔

”کیا وہ یونہی زندگی گزار دے گا۔“

”کیا ہوگا؟“

”کیا کرے گا؟“

آج وہ بہت بے قرار تھا۔ اس نے الماری کھولی اور شراب کی بوتلیں

نکلنے لگی۔ بوتل کا کاک کھول کر اس نے بوتل منہ سے لگلی۔ جیسے وہ ساری سختی

اس بوتل میں گھول رہا ہو۔

چہرے کی رگیں پھول گئی تھیں اور دماغ میں جیسے ایک لادہ اٹل رہا تھا۔

دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ سوچنے لگا۔ لوگ کہتے ہیں شراب دینا ومانیہا سے بے خبر کر دیتی ہے لیکن

میں تو سلگ رہا ہوں بلکہ مجھے اور بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں دیکھی ہوں مگر پھر

آہستہ آہستہ وہ ایک سرور سا محسوس کرنے لگا آنکھوں کے آگے تمام چیزیں

ناچنے لگیں اور اس کی آنکھیں دھندلی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

کمرے میں گنگا سا اندھیرا پھیل گیا۔ وہ اٹھا اور اسے یاد آیا کہ بتیاں روشن ہو گئی ہیں اور اس اندھیرے میں ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں اب دن ہوا ہے۔ جہاں اب زندگی جاگی ہوگی اور پھر ایسی جگہ کی تلاش میں وہ سڑکوں پر بھٹکنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا نے کچھ اچھا ہی اثر کیا اور وہ پبلک پارک میں جا بیٹھا۔ جہاں کئی طالب علم بیٹھے تھے۔

رات تاریک ہو کر ہر طرف پھیل گئی تھی۔ ناصر کی طبیعت بھی اب کچھ سکون محسوس کر رہی تھی۔ وہ اٹھا اور ایک بار پھر ان جانے پہچانے رستوں پر چل دیا۔ ہر طرف طلبے کی تھاپ پر سرلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے اس نے ایک ایسی آواز سنی کہ اس کے قدم رک گئے۔ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر ان تاریک میڑھیوں کو طے کرنے لگا۔

کمرہ قہقروں سے روشن تھا اور گھنگروں کی جھنکار فضا میں ایک غنوغی پیدا کر رہی تھی۔

ناصر تھکنے کے قریب بیٹھ گیا۔

”تشریف رکھئے“ ایک سرلی سی آواز گونجی۔

ناصر نظریں جھکائے اس آواز کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے ہے؟

”پان لیجئے۔“ ایک قتالی اس کے قریب آئی اور ساتھ ہی ناصر کی نظریں اٹھیں اور وہ جھج اٹھا۔

”بانو۔ تم“

اور بانو بھی حسرت سے ناصر کو دیکھ رہی تھی۔

اور پھر وہ سب کچھ پھوڑ کر ناصر کے قدموں پر گر پڑی۔

”ذلیل کمینے۔“ ناصر نے دو چار تھپڑ بانو کے گالوں پر جڑ دئے۔ مکار۔

ہوں پاگل بنی ہوئی تھی۔ آخر کیوں یہی جگہ تھی؟“

”ناصر۔ ناصر“

”مرگیا تمہارا ناصر۔ ہٹ یہاں سے۔“ ناصر کو بہت غصہ آ رہا تھا۔

”میری بات تو سنو بانو جی۔“ بانو روتے ہوئے بولی۔

”مکار، ذلیل، تمہاری یہی جگہ تھی۔“ ناصر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور

پہرے کی رگیں ابھر آئیں۔

بیٹھے ہوئے تماشائی چپکے سے کھٹک گئے۔ شاید انہیں عزت کا ڈر تھا۔

”آپ بیٹھے تو سہی۔ بات تو سنئے۔“ ایک موٹی سی عورت نے ناصر سے

کہا۔

”میں کوئی بات نہیں سنتا چاہتا۔“ ناصر جلدی جلدی دروازے سے باہر نکل

گیا۔

”اف۔ بانو۔ معصوم لڑکی۔ یہاں۔“

ناصر غصے میں سوچ بھی نہ سکا کہ شاید بانو کے حالات یہاں لے آئے ہوں،

مگر نہیں۔ وہ تو پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے یہ ڈھونگ کیوں رچایا، وہ پریشان تھا

لیکن ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں لاوا اگلنے لگا۔ یہ اس کی محبت کی توہین تھی۔

کوٹھی سنسان تھی۔ وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

خلاف معمول اکبر علی اس کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

”آپ“ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔

”آگئے۔ گھر کا خیال آ گیا۔“

”گھر۔ کس گھر۔ میرا کوئی گھر نہیں۔“

”تو پھر کہاں آئے ہو؟“

”جیل میں“

”جیل میں“ اکبر علی غصے سے چلائے۔

”جی ہاں جیل میں۔ آخر قیدی جو ٹھہرا۔“ ناصر نے بڑے اطمینان سے

جواب دیا۔

”ناصر۔“ اکبر علی کی آواز میں رقت تھی۔

”مجھے تما چھوڑ دیجئے۔ آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔“  
 ”یہ کیا ہے۔“ اکبر علی نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔  
 ناصر نے سر جھکا لیا۔

”ناصر تم اپنی جوانی کیوں برباد کر رہے ہو۔“

اباجان۔ ”ناصر نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

”کیا کتنا چاہتے ہو؟“ باپ کا لہجہ دھکی تھا۔

”میں نرسن کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“ اکبر علی حیرت سے چیخ پڑے۔

”جی ہاں“

”مگر کیوں؟“

”میں اس کو سکھی نہیں رکھ سکتا۔“

”یہ فیصلہ تم نے سوچ کر کیا ہے۔“ اکبر علی پریشانی کے ساتھ ساتھ شرمندہ

بھی تھے۔

”جی ہاں“

”اور تم نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ اس کے ساتھ میری بیٹی عزت

خاک میں مل جائے گی۔ ہم تلاش ہو جائیں گے۔“

”ہم کہیں ملے جائیں گے اباجان میں جوان ہوں۔ کماؤں گا آپ کو بھی

تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔“ ناصر کو جیسے اپنے سامنے روشن مستقبل نظر آ رہا تھا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ یہ فیصلہ مجھے منظور نہیں تو؟“

”تو۔ تو میں مجبور ہوں اباجان“ ناصر کو آخر وار بھی خالی جانا نظر آ رہا تھا۔

میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اس کے بعد پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں کہیں چلا جاؤں گا۔ اور ج پوچھو تو میں آج چلا گیا تھا۔ آپ کا خیال

مجھے واپس لے آیا۔“

”تو پھر آج کیوں مجھے چھوڑ رہے ہو؟“

”میں تو نہیں چھوڑ رہا۔ آپ ہی چھوڑ رہے ہیں۔“

”میتا میرے بڑھاپے کا کچھ خیال کرو۔“ اکبر علی کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

”میں نے بہت کوشش کی۔ لیکن میں اب نہیں ٹھہر سکتا۔“

”بچے کی پیدائش کے بعد شاید نرسن سنبھل جائے۔“

”مجھے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”مجھے حیرت ہے کہ تم اتنے کم عقل کیوں ہو گئے ہو؟“

”اباجان آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کا میتا مر گیا اور اگر میں زندہ رہا اور

نہیں کامیاب ہو گیا۔ تو آپ کو نہیں بھولوں گا۔“

”تم نہیں جانتے۔“ اکبر علی اٹھتے ہوئے بولے۔

اور ناصر نہ جانے کیوں ہنس دیا۔

اکبر علی کمرے سے باہر نکل گئے۔ ناصر اب تک اپنے باپ کی بات پر مسکرا

رہا تھا۔

اگر واقعی اباجان کو مجھ سے محبت ہے تو پھر یہ سب کچھ چھوڑ کر میرے

ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ انہیں مجھ سے زیادہ یہ دولت عزیز ہے، یہ عزت عزیز

ہے۔“

اس کے دماغ میں کئی نقشے ابھر اور بگڑ رہے تھے۔ کبھی نرسن، کبھی اپنا باپ

اور پھر کبھی بانو۔ بانو۔ طوائف۔

بانو طوائف کیسے بن گئی؟ کہاں ایک پگلی اور کہاں ایک طوائف۔ وہ اس

زندگی کو اپنا جنمیں۔ وہ مر بھی سکتی تھی۔ ایس ذات سے خود کشی کر لیتی۔ اس کے

نور طریتے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ واقعی کسی طوائف کی بیٹی ہے۔ ات

اس پیشے سے نفرت نہیں۔

اور پھر اس نے آخری بوتل بھی خالی میں انڈیل لی۔

سگریٹ سلکا کر وہ بالکونی میں آکھڑا ہوا تھا۔ رات جوان تھی۔ چاندنی رات

ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ نکھری نکھری۔

وہ اس حسین منظر میں گم ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”مگر وہ۔ یہاں کیسے آگئی؟“ اچانک ناصر نے پوچھ لیا۔

”اوہ۔ میرے ساتھ آؤ۔“ عورت ناصر کو اوپر لے گئی۔

یوں لگتا تھا۔ جیسے عورت کو بالو بہت عزیز تھی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔

”بابو وہ بگلی تھی۔“

”بگلی“ ناصر ہنسی کے ساتھ بولا۔

”ہاں بابو وہ بگلی تھی۔ میں اپنی بہن کے ہاں ملتا مگنی تھی اور پھر جب میں نیکی میں گھر آ رہی تھی تو ایک بگلی نیکی کی زد میں آ کر بے ہوش ہو گئی۔ اسے کچھ چوٹیں بھی آئیں۔ لوگوں نے نیکی والے کو پکڑ لیا اور پھر بالو کو ہسپتال لے آئے۔ مجھے اس پر رحم آیا کہ میں نے ہسپتال میں سیشن وارڈ میں کمرہ لے لیا اور بالو کا علاج کرائے گئی۔ دماغی امراض کے ماہرین اس کا علاج کرنے لگے، اور پھر وہ ٹھیک ہونے لگی۔“

وہ اتنی معصوم تھی کہ اسے دنیا کا ہیرا پھیری کا پتہ نہ تھا، اس لئے یہاں لے آئی اور پھر میں اسے سمجھاتی رہی۔ وہ ہمیشہ آپ کو یاد کرتی تھی۔ اپنے بھائی کی یاد میں روتی رہتی تھی۔ میں نے اسے اپنی بیٹی بتالیا اور تسلی دیتی رہی۔ اور بابو کل رات وہ آپ سے ملنے کے بعد تڑپ تڑپ کی روٹی، میں اسے بہت تسلی دیتی رہی۔ لیکن وہ بہت بری طرح رو رہی تھی۔

ناصر گم سم بیٹھا تھا۔

”وہ کمرے میں جو گئی تو صبح مری ہوئی نکلی۔ اس نے ہیرا چاٹ لیا۔ مجھے کیا پتہ تھا۔ وہ آگوشی میں سے اسے پرسوں ہی لا کر دی تھی۔“

ناصر نہ جانے کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا اور پھر چپ چاپ چلا آیا۔

دعید بھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

آج اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب یہاں نہیں رہے گا۔ وقت دیکھا۔ ساڑھے سات بجے تھے۔ شام بگلی سی تھی اور جھٹ پٹ وہ اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا لیکن اچانک اسے کچھ یاد آگیا۔ وہ گھر گیا اور اپنی لی اسے کی سند لی اور



اور پھر صبح خلاف توقع ایک نئی بات ہوئی۔

جسے سن کر ناصر تڑپ اٹھا۔

ہوایوں کہ دوپہر میں ناصر پان کی دکان پر سگریٹ خرید رہا تھا۔ وہاں پر پان والا بڑے زور شور سے ایک طوائف کی خودکشی کی داستان کسی دوسرے آدمی کو سن رہا تھا۔

ناصر چونک گیا۔ رات کس طوائف نے خودکشی کر لی۔ کہیں وہ بالو تو نہیں۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ بالو ہی ہو سکتی ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بالو کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

اور واقعی بالو کے کونٹھے پر کئی طوائفیں جمع تھیں۔

اس نے دیکھا کہ دعید سر جھکائے چارپائی پر بیٹھا ہے۔ اسے دیکھ کر دعید دوڑ کر اس سے پلٹ گیا۔

”میری بہن مر گئی بابو۔ وہ کل ہی ملی اور آج مر گئی۔ میں تلاش کرتے کرتے تھک گیا تھا اور وہ پھر مجھے چھوڑ گئی۔ اس نے خودکشی کر لی۔“

اور ناصر گم سم کھڑا تھا۔ وہ اپنے آپ بڑبڑا رہا تھا۔ اسے مرجانا ہی چاہئے تھا۔ اچھا ہوا میری محبت کی لاج رہ گئی۔ اگر وہ زندہ رہتی تو۔ اور اسی اثنا میں ایک بگلی عورت آ کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”بابو جی تم نے میری بیٹی مجھ سے چھین لی ہے۔“

اشیش آگیا۔

سندھ ایکسپریس کراچی کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اس نے ٹکٹ خریدا۔ جب میں صرف سو روپے کا ایک نوٹ اور کچھ ریڑ گاری تھی ٹکٹ اس نے تھڑکلاس کا خریدا۔

گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی اور لاہور کی بتیاں نظروں سے اوجھل ہونے لگیں۔

”اب میں لاہور نہیں آؤں گا۔ کبھی نہیں آؤں گا۔“

☆☆☆

اور پھر دوسرے دن کا سورج اسے کراچی کی سرزمین پر اپنی جھلک دکھانے لگا۔ گو اسے طرح طرح کے خیالوں نے گھیرا ہوا تھا لیکن وہ ان پر قابو پا چکا تھا۔ حالات سے مقابلہ کرنے کا عزم دل میں پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ اشیش سے سداوہ قمر کے گھر کی طرف چلا گیا۔ قمر کراچی کے منجانب علاقے میں رہتا تھا۔ ٹیکسی والا بھی ہار گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کی چھان بین کے بعد قمر کا گھر ملا۔ علاقہ بڑا منجانب تھا لیکن قمر کا مکان اندھوں میں کانا راجہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان جھوٹوں اور ٹوٹے پوٹے گندے مکانوں کے درمیان قمر کا اینٹوں کا مکان تھا۔

قمر گھر پر ہی مل گیا۔

ارے تم۔؟ وہ بار بار ناصر کو گلے سے لگا رہا تھا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دینے کے بعد وہ اسے مکان کے اندر لے گیا۔

ایک خوبصورت سی دھڑو کو دیکھ کر ناصر کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی اور قمر بھی مسکرا دیا۔

”تم غسل کر لو پھر سب سے ملاقات ہو جائے گی۔“

ناصر غسل خانے میں گھس گیا اور قمر اس کے کھانے کے لیے اہتمام روانے لگا۔ ناصر جب تیار ہو کر آیا تو دسترخوان پر کھانا لگ چکا تھا اور قمر انتظار میں تھا۔

”اچھا تو پھر تعارف کروایا جائے۔“ ناصر مسکرا کر بولا۔

”تعارف۔“ قمر نہ جانے کیوں جھینپ رہا تھا۔

”تو یہ بات تھی۔ ہم سے بھی پردہ۔ میں ابھی واپس جاؤں گا تم مجھے غیر سمجھتے ہو۔“ ناصر صبح روٹھ رہا تھا۔

”بہی شادی اچانک ہو گئی۔ دراصل مجھے اتنا موقع ہی نہیں ملا۔ کہ تم کو لکھ سکتا۔ میں۔“

”اچھا تو شادی بھی ہو گئی ہے۔“

قمر نے سر جھکا لیا۔

”ہوں۔ تب ہی کراچی بھاگے آتے تھے۔ نئی دنیا ہے۔ ہنگامہ پرور شہر ہے۔“

قمر ہنس دیا۔

”خیر اب میں مبارک باد شام ہی کو دوں گا۔ بھابی کو بلواؤ۔“

”یار وہ تم سے شرماتی ہیں۔“

”تو پھر اٹھاؤ کھانا۔ ہم کھانا نہیں کھاتے۔ بھلا بھابی مجھ سے پردہ کرے گی۔“ اور قمر مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔

ناصر قمر کی شادی پر حیرت زدہ تھا۔ قمر کا کوئی نہ تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ ایک بہن تھی جس کی شادی لاہور ہو چکی تھی اور وہ اپنے میاں کے ساتھ وہیں رہتی تھی۔ اور قمر شادی کو عذاب سمجھتا تھا۔

قمر کے پیچھے ہی اس کی شرماتی ہوئی بیوی آئی۔

”آداب۔“ وہ جھنجھنی جا رہی تھی۔

”جنتی رہو۔“ ناصر شرارت سے بولا۔ ”یہ آپ کے مجازی خدا تو بڑے



لیٹ گیا۔

”سناؤ مجھے بھائی کا کیا حال ہے“ قمر نے پوچھ ہی لیا۔

”قمر“ ناصر چونک کر بیٹھ گیا۔

”تم میرے دوست ہو نا؟“

”کوئی شک ہے تمہیں“

”نہیں مگر میری ایک بات مانو گے؟“

”کہو“

”تو آئندہ میرے سامنے اس طرح کا کوئی ذکر نہ کرنا۔“

”کیسا ذکر؟“

”میری بھالی وغیرہ“

”آخر وجہ؟“

”میں سب کچھ چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ مجھے

بُٹھ یاد نہ دلانا۔ کچھ یاد نہ دلانا؟“

”تمہاری مرضی۔ آئندہ کبھی نہ چھیڑوں گا۔“ ناصر کی حالت سے قمر بھی ڈر

لیا۔

نہ جانے اتنی سی بات نے ناصر کا موڈ کیوں خراب کر دیا۔ وہ چپ چاپ

لیٹ گیا۔ کچھ دیر پہلے وہ سب کچھ بھولا ہوا تھا اور ایک زندہ دل انسان تھا لیکن

ایک ہی لفظ نے اس کے دماغ میں ہچکل مچا دی اور پھر اسے وہی باتیں پریشان

نہ کرنے لگیں۔

نسرین

اکبر علی

بانو

دولت

جانیداد

اور قمر کو افسوس ہونے لگا اس نے ناصر کو کیوں کریدا۔

ناممقول قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ شادی کا پتہ بھی نہ دیا۔“

”اچھا تو یہاں ہی تعارف کرا لیتے ہوں۔“ قمر درمیان میں بول اٹھا۔

”یہ ہیں مسٹر ناصر جن کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ میرے اکلوتے

دوست اور محرم راز۔“

قمر کی بیوی محرم راز کے لفظ پر مسکرا دی۔

”اور میاں یہ ہیں تمہاری بھالی نہرا“

”کیا مطلب؟“ ناصر نے پوچھا۔ ”یعنی نمبر ۲، نمبر ۳ کا بھی ارادہ ہے۔“

”انسان ہوں بجی، حالات ساتھ نہیں دیتے۔“ قمر نے بیوی کی طرف دیکھ

کر کہا۔

قمر کی بیوی کے ماتھے پر ہل بڑھ گئے لیکن وہ مسکرا رہی تھی۔

”بک بک بند کرو اور سیدھی طرح بھائی کے متعلق بتاؤ کہ وہ تم جیسے جانو،

سے کیسے شادی کر بیٹھیں۔“ ناصر نے ڈانٹ دیا۔

”ان کا نام رقیہ بیگم ہے اور اب یہ مسز قمر ہیں اور بس ہوگئی شادی۔“

قمر نے غرور سے سر اوپر اٹھایا۔

ناصر ہنس کر بولا۔ ”واہ کیا تعارف کروایا ہے۔“

”کھانا کھنڈا ہو رہا ہے بھائی جان“ رقیہ نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

”اچھا“ تو آپ بھی منہ میں زبان رکھتی ہیں۔ میں تو سمجھا بھائی خداخواست

گوئی ہیں۔“ ناصر موڈ میں تھا۔

”جی ہاں گوئی ہیں۔ دو چار روز رو رہے پتہ چل جائے گا۔“

”تو کیا آپ مجھے دو چار روز رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ ناصر کھانا کھاتا ہوا

بولا۔

”بڑے ہی سزی دماغ کے ہو۔ میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔“

”تم یوں ہی بات کہتے ہو۔۔۔“

”کھانا مزیدار تھا۔ باتوں میں کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔“

رقیہ برتن اٹھا کر لے گئی۔ ناصر نے سگریٹ سلگا کر قمر کو دیا اور خود چارپائی

”مجھے معاف کر دو دوست قمر“ ناصر کی حالت کو بدلتی ہوئی دیکھ کر بولا۔

ناصر مسکرا دیا۔ ”میں تمہارے پاس سب کچھ چھوڑ کر آیا ہوں۔ قمر۔ میں نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے اس میں مدد دو گے اور اگر یہ زندگی بھی راس نہ آئی تو میں خودکشی کروں گا۔“

”آرام کر لو ناصر۔ تم تجھکے ہوئے ہو؟“

”نہیں قمر۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے عہد لینا چاہتا ہوں کہ تم بھی اس ناصر کو بھول جاؤ۔ تاکہ تم مجھے کچھ یاد نہ دلا سکو۔ میں اپنی یادداشت کھو دینا چاہتا ہوں۔ آج کے بعد ایک نیا ناصر اس دنیا میں آئے گا جس کا کوئی نہیں۔ جو تمہارے جسے دنیا میں رہنے کے لیے کام کرنا ہے۔

”تم جیسے چاہتے ہو ویسے ہی ہوگا۔“ قمر نے جواب دیا۔

”ہاں قمر“ میں کام کروں گا۔ کہیں لوکری کروں گا۔ کماؤں گا۔ مصروف ہو جاؤں گا۔ ایک آزاد انسان ہوں گا۔ اور تم وعدہ کرو کہ آئندہ نہ کسی سے کچھ کہو گے اور نہ ہی مجھے کوئی ایسی بات یاد دلاؤ گے جو میرے احساس کو مجروح کرے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“ قمر نے کہا۔

”یہاں تمہارے سوا مجھے کوئی نہیں جانتا قمر کیا بھابی کو تم نے کچھ بتا دیا ہے۔“ ناصر نے چونک کر کہا۔

”نہیں رقیہ کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ صرف تمہیں جانتی ہے۔“

”یہ بڑا اچھا ہوا۔“ ناصر کو اطمینان ہو گیا۔

”میری شادی کو ایک ہفتہ ہوا ہے۔ اتنے میں دنیا کی کیا کیا باتیں اس سے کروں گا۔ ابھی میری اپنی باتیں ختم نہیں ہوئیں۔“ قمر گفتگو کا رخ بدلنا چاہتا تھا۔

ناصر مسکرا دیا۔

”تم آرام کرو ناصر بھابی اکیلی ہے۔“ قمر ہنستا ہوا چلا گیا۔

ناصر بھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

اور اگلے دن واقعی ناصر بدل گیا تھا۔ صبح اٹھ کر اس نے شیوہ بنائی، نمایاں کپڑے بدلے اور منگلتا ہوا اندر کی طرف گیا۔

رقیہ ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ قمر کرسی چارپائی خانے میں رقیہ کے قریب بیٹھا اس سے ہاتھ ملا کر باتیں کر رہا تھا۔

”ہیلو“ قمر“ ناصر کو دیکھ کر بولا۔

”کیا عورتوں کی طرح ہاتھ ملا کر باتیں کر رہے ہو۔“ ناصر ہنس دیا۔

”کچھ نہیں یار تمہاری بھابی کو بتا رہا ہوں کہ شادی سے پہلے میں انڈے کیسے تھلا کرتا تھا۔“ رقیہ ہنس رہی تھی۔ ناصر نے دیکھا وہ سفید رنگ کی ایک تکیے ناک نقشے کی پتلی سی لڑکی تھی۔ آنکھیں جہنی جیسی تھیں اور ان میں جیا رقصاں تھیں۔ ہاتھوں پر ہندی اور کلانیوں میں سرخ چوڑیاں اسے نئی ٹوپلی دلہن ظاہر کرتی تھیں۔ قمر ایک کرسی اٹھا لایا۔ ”بھئیو یار“

ناصر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”بھابی کے والدین کہاں ہیں؟“

”والدین کی طرف سے یہ بھی بد قسمت واقع ہوئی ہے۔“

اس ذکر سے رقیہ کی آنکھوں میں اداسی نچک آئی۔

”اچھا“ ناصر افسوس سے بولا۔

”اور ہاں ان کے چچا نے ان کو پالا ہے۔ اور پھر۔“

”پھر کیا؟“ ناصر نے پوچھا۔

”پھر یہ اس وقت تمہارے لیے انڈے قُل رہی ہیں۔“

”بڑے استاد ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری پہنچ کیسے ہوئی؟“

”میری پہنچ ان کے چچا نے مجھے دیکھا، پسند فرمایا۔ کسے گئے بڑا ہونمار پچہ

ناشتہ کے بعد قمر نے کپڑے بدلے اور سائیکل اٹھائی اور ناصر بھی ساتھ تھا۔ دونوں باہر نکلے۔

”اب مصیبت یہ ہے کہ سواری کے بغیر یہاں کچھ نہیں بنتا۔“ قمر نے کہا۔  
 ”تم نے خواہ مخواہ سائیکل لے لی۔ دونوں رکشا پکڑ لیتے۔“  
 ”اچھا تو میں سائیکل چھوڑ کر ابھی آیا۔“  
 ”اسی بھانے بھابی سے اور باتیں کر لو گے۔“

”ہاں آج الدوار بھی نہیں کئی۔“ قمر ہنستا ہوا چلا گیا۔  
 اس کے جانے کے بعد ناصر نے سوچا کہ وہ اب یہاں نوکری کرے گا۔ قمر ایک دفتر میں پرنٹنگ تھا اور اسے بھی ضرور کہیں جگہ مل سکتی تھی کیونکہ اس نے اپنی نئی زندگی جو شروع کرنی تھی۔ اتنے میں قمر آتا دکھائی دیا۔ دونوں نے رکشا لیا اور صدر کی طرف روانہ ہوئے۔

راستہ چلتے ہوئے قمر نے پوچھا۔ ”تو پھر کیا کام کی باتیں تھیں۔“  
 ”قمر میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔“

”نوکری؟“ قمر کو حیرت ہوئی۔  
 ”ہاں نوکری۔ میں نئی زندگی شروع کر رہا ہوں اور اب میں لاہور نہیں جاؤں گا۔ مجھے یہاں کوئی ذریعہ معاش ڈھونڈنا ہے۔“

”یہی بھی کیا جلدی ہے۔ کچھ دن کراچی کی سیر کرو۔“  
 ”نوکری کون سا میرے آگے ہی پڑی ہے۔ تقریباً ایک ماہ لگ ہی جائے گا۔“

”بھئی فکر کس بات کا ہے۔ نوکری بھی مل جائے گی۔“

”یاد تم مذاق میں مت ٹالو۔“  
 ”نہیں ناصر میں بالکل مذاق نہیں کر رہا۔ مل جائے گی اور پھر؟“  
 ”اور پھر کیا؟“

”پھر کچھ نہیں۔ یہ صدر آگیا۔ یہ میرا آفس ہے۔“  
 ”چلو“ رکشا والے کو پیسے دے کر وہ دونوں لفٹ میں آکھڑے ہوئے اور

ہے۔ ماشاء اللہ“

ناصر بس دیا اور رقیہ بھی مکرار رہی تھی۔

”تو پھر خدا تمہارا بھلا کرے۔“ فرمانے لگے بیٹا شادی شدہ ہو۔“

”میں نے کچھ نہ کہا۔ سچ بچ ہم شرمائے۔“

ناصر نے قہقہہ لگایا۔ ”تم شرمائے اور پھر۔“

”پھر کہنے لگے بڑا شرمیلا بچہ ہے۔“

رقیہ بس کر بولی۔ ”اب بس کیجئے ناشتہ تیار ہو گیا ہے۔“

”ہاں تو پھر ناصر یہاں کہنے لگے۔ قمر میں میری بیٹی ہے۔ شادی کرو گے۔ تو ہم نے حیا سے آنکھیں پٹی کر لیں۔ کیا بتاؤں ناصر میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ حلق خشک ہو گیا۔ شرم آ رہی تھی۔“ قمر لڑکیوں کی طرح شرم رہا تھا اور ناصر ہنستے ہوئے رقیہ سے کہنے لگا۔ ”کیوں بھابی یہ سچ کہہ رہا ہے۔“

رقیہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”بالکل جھوٹ اتنے شرمیلے تو نہیں ہیں۔“

”ہائیں“ یعنی ہم شرمیلے نہیں۔ کمال کرتی ہو۔ سچ ایسا ہی ہوا ہے۔ مجھے اب تک تم سے شرم آتی ہے۔ اب کیا کہوں۔ تم ناشتہ تیار کر رہی ہو اور میں شرم سے بل کھائے جا رہا ہوں۔“

”بس کرو سسٹر۔ دفتر کا وقت ہو گیا ہے۔“ ناصر ہنستے ہوئے بولا۔

”کام کی ایک بات نہیں کی اور بک بک لگا رکھی ہے۔“

”لو میاں اب تم کام کی بات کر لو۔“ قمر ناصر کی طرف منہ پھیر کر کہنے لگا۔

”کام کی بات یہ ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ باہر جانا چاہتا ہوں۔“

”چلو“ میں نے کوئی منع کیا ہے۔“ رقیہ نے انڈے ہلٹیوں میں ڈالے اور چائے کیتلی میں انڈیلنے لگی۔ اندر چلے۔“

”چلو بھائی حکم مانو۔“

ناصر قمر کے ساتھ اندر چلا گیا۔ رقیہ ناشتہ لے آئی اور ناصر نے رقیہ کو بھی ساتھ بٹھالیا۔ وہ سب ناشتہ کرنے لگے۔

دو منٹ میں اوپر پہنچ گئے۔ قراچے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔  
 کچھ دیر ناصر بھی بیٹھا رہا۔ پھر وہ اٹھا گیا اور قمر سے کہہ کر چلا آیا۔ کافی دیر  
 تک وہ صدر گھومتا رہا۔ پھر ٹیکسی پر کلفٹن چلا گیا...  
 کلفٹن سونا پڑا تھا۔ زیادہ لوگ نہ تھے۔ وہاں تو شام کو رونق ہوتی ہے۔  
 پھر یونی کیفے میں بیٹھا رہا  
 اور

کھانے کے وقت گھر لوٹ آیا۔



اور پھر کئی دن بیت گئے۔ ناصر کئی ایک جگہ قسمت آزمائی کر چکا تھا، لیکن  
 ابھی قسمت کا چکر پورا نہیں ہوا تھا۔

لیکن وہ بور نہیں ہوا تھا۔ قمر اسے ہنستا رہتا اور پھر وہ دفتر کے چکر  
 لگاتا۔ ایمپلائمنٹ ایجنسی کے دفتر میں بیٹھا رہتا۔ دوپہر کو قمر کے ساتھ گھر آتا،  
 کھانا کھاتا پھر آرام کرتا اور شام کو وہ، رقیہ اور قمر سیر کو چلے جاتے۔ کبھی  
 کلفٹن، کبھی پکچر اور کبھی یونی پھرتے رہتے تھے۔

ناصر نا امید نہیں تھا، مطمئن تھا۔ اسے جیسے یقین آ گیا تھا کہ وہ نئی زندگی  
 میں خوشیاں دیکھے گا۔ اب اسے بانو یاد نہیں آتی تھی۔ نہ جانے کیوں، شاید وہ  
 ماضی کی یاد کو مٹا رہا چاہتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اسے اکبر علی کی یاد بری طرح ستاتی  
 تھی۔ دل میں ہوک سی اٹھتی۔

اور کل تو ایک واقعہ ہوا کہ اس کی قدم ڈگلائے۔ نئی زندگی کا عزم  
 ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ ہوا یوں کہ اخبار میں اس نے اشتہار پڑھا جو اکبر علی کی  
 طرف سے تھا۔ اشتہار کچھ یوں تھا۔

”ناصر کے نام“

”ناصر تم جس دن سے گئے ہو۔ میں بہت پریشان ہوں  
 تم جو کمرے میں ماسن کو تیار ہوں۔ تم لوٹ آؤ۔“

اکبر علی

اور اس کا دل پہنچ گیا لیکن پھر اس نے نہ جانے کیسے قابو پا لیا۔

قرن نے اس سے کچھ نہ کہا۔ شاید اس لیے کہ ناصر یہ نہ سمجھے کہ وہ اس سے آگیا ہے۔ اس نے رات سوچ میں گزار دی تھی۔ صبح اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ناصر کو نہیں جانا چاہیے۔

حسب معمول رقیہ نے ناشتہ تیار کیا اور قرمر کی مشکلہ خیز باتوں میں ناشتہ کیا گیا۔

”قر“ ناصر نے اسے اٹھنے دیکھ کر کہا۔

”فرمائیے جناب“

”بھئی ہمارے لیے بھی کچھ فرمائیے۔“

”تم تو تیار مفر کھا گئے ہو۔ ہو جائے گا سب کچھ۔“

”ہو جائے گا ٹھیک ہے لیکن کب؟“

”جلدی۔“

”بھائی جان آپ کا اپنا گھر ہے۔ آپ کیوں ایسا سوچتے ہیں۔“ رقیہ نے بے تکلفی سے جواب دیا۔

دیکھئے بھائی اور تو کوئی بات نہیں لیکن میں بیکاری سے بور ہو گیا ہوں۔  
”ہمارا کوئی بچہ بھی نہیں۔ جس کے لیے ہمیں آیا رکھ لیتے۔“ قرن نے کمال سنجیدگی سے کہا اور رقیہ جھینپ گئی۔

”مذاق میں نہ ٹالو قر“

”میں مذاق نہیں کر رہا۔ اب تم چپ ہو جاؤ۔ میں خود ٹھیک کر لوں گا۔“  
”اچھا تو رقیہ صاحبہ آج آپ کہاں جا رہی ہیں۔“ قرن نے رقیہ کی چوٹی پکڑ لی۔

”میں نے غلط کہا تھا بھائی کہ جناب چڑیا گھر کی مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں۔“  
”بھئی، صبح بڑے ناز سے پوچھ رہی تھیں، میں جاؤں۔“ قرن نے رقیہ کی

نقل اناری۔

”کہاں جاؤں؟“ ناصر نے پوچھا۔

”یہ ان ہی سے پوچھو۔“

”کچھ نہیں بھائی جان میں اپنی ایک سیٹلی کے پاں جا رہی ہوں، میاؤں شریف ہے وہاں۔“ رقیہ نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا۔

”تو جائیے اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”چلو بھائی“ قرن جوتے کے تسمے بانٹتے ہوئے بولا۔

”کہاں؟“ ناصر نے پوچھا۔

”دفتر“

”مگر میں تمہارے دفتر جا کر کیا کروں گا؟“ ناصر نے بے بسی سے کہا۔

”اماں چلو تو کسی۔“ میںیں پر فٹولی لگا رہے ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ بھائی جان کو ضرور کوئی نوکری مل گئی ہے۔ یہ بتا نہیں رہے۔“ رقیہ نے خوش ہو کر کہا۔

”ہوں۔ بتا نہیں رہے۔ مجھے تو اس لڑکی پر حیرت ہے ناصر شادی کو ابھی مشکل سے ایک ماہ ہوا ہے اور یہ پڑ پڑ باتیں کرتی جاتی ہے۔“

قرمر پھر رقیہ کی پیچھے پڑ گیا۔

رقیہ شرم سے لال ہو گئی اور منہ بناتی ہوئی باورچی خانے کی جانب چلی گئی۔  
”تم بہت ستاتے ہو بے چاری کو۔“ ناصر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

اور قرمر بھی ہنس کر بولا۔ تم باہر نکلو میں ابھی آیا۔“

ناصر باہر نکل آیا۔

کچھ دیر بعد قرمر بھی آگیا اور دونوں دفتر چلے گئے۔ قرمر آج غیر معمولی طور پر اس لیے خوش تھا کہ ناصر کو سروس دینے کا اس کے آفسر نے وعدہ کیا تھا۔

دفتر پہنچ کر بھی ناصر کو قرن نے نہیں بتایا، بلکہ اسے اپنی کرسی پر بٹھا کر اندر چلا گیا۔ ناصر اس کے رویے پر حیران تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے قرمر مسکراتا ہوا باہر آیا۔

”مبارک ہو دوست“

”مینجری“

”کیسی مینجری؟“ وہ اب بھی نہ سمجھ سکا۔

ناصر نے جب سب سے مل لیا تو قمر کے ساتھ واپس آگیا۔ آج قمر نے بھی آفس سے چھٹی لے لی تھی۔

پھر وہ دونوں گھر چلے آئے۔ رقیہ میلاد میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ناصر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ جیسے یہ نوکری واقعی اسے نئی زندگی بخش دے گی۔

وہ سرت سے سرشار تھا اور ہنستا ہوا کہنے لگا۔

”بھائی آپ کی بات بالکل سچی ہوئی۔ یہ مکار ہم سب کو بیوقوف بنا رہا تھا۔“

”کیا بات ہے بھائی جان“

”مجھے سروس مل گئی۔“

”اچھا“ رقیہ بھی خوش ہو گئی اور اسی لمحے ناصر کچھ کھو سا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ واقعی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ رقیہ کتنی معصوم سی ہے۔“

کتنی اچھی ہے اور نرسن۔ لیکن نرسن کا نام ذہن میں آتے ہی اسے وہ عزم یاد آگیا۔ پچھلی زندگی کو ترک کر دینے کا۔ اور پھر اس نے نرسن کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

رقیہ کھانے آئی اور وہ تینوں مل کر کھانا کھانے لگے۔

”اچھا تو پھر آج میلاد شریف ہے۔“ قمر اپنی عادت سے مجبور ہو کر بولا۔

رقیہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”کیا تمہارا بھی جانے کا ارادہ ہے۔“ ناصر نے قمر سے پوچھا۔

”میں یار وہاں تو وہ لوگ جاتے ہیں جن کو کوئی مراد مانگنی ہوگی۔“

”معاف کیجئے۔ میں نے کوئی مراد نہیں مانگنی۔“ رقیہ نے کہا۔

”جی ہاں اتنی تو آپ ہیں۔ اب ناصر بھائی کیا بتاؤں تمہیں۔ مرادیں مانگ

مانگ کر تو انہوں نے مجھے پایا ہے۔“

”اللہ توبہ۔۔۔ کتنا جھوٹ۔“ رقیہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور ناصر ہنسنے لگا۔

”جی ہاں جھوٹ میں سب دیکھا کرتا تھا۔ بیروں کے حزاروں پر رقیہ سلطانہ

”اندر چلو۔“ اور وہ اسے صاحب کے کمرے میں لے گیا۔ کاظمی صاحب نے ناصر کو دیکھ کر کہا۔ ”اچھا تو آپ ہیں مسٹر ناصر؟“

ناصر نے معافی کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اچھا تو ناصر صاحب آپ ہمارے بند روڈ والے آفس میں بطور مینیجر کام کریں گے۔ امید ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری اچھی طرح سمجھیں گے۔“

اور ناصر نے خوشی اور حیرت سے قمر کی طرف دیکھا جو منہ پھیر کر مسکرا رہا تھا۔

ناصر نے کاظمی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور قمر کے ساتھ باہر چلا آیا۔

قمر نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔“

”یہی کہ رقیہ بھائی جتیں سمجھ گئی ہیں۔ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ جانوروں

کی طرح جا کر بٹھا دیا۔“

قمر نے قہقہہ لگایا۔ اچھا چھوڑو اب یہ۔۔۔ پروگرام بتاؤ۔“

”پروگرام تم بتاؤ۔ میں نے تو سروس کی نہیں کبھی۔“

”اچھا تو میرا خیال ہے چلو پہلے بند روڈ والے محلے سے تمہارا تعارف کروا

دوں گا۔“

”چلو۔“

بند روڈ کا آفس ایک بڑی بلڈنگ میں تھا۔ یہ آفس فیکٹریوں کے تھے۔ مسٹر عبدالحمید کاظمی ان فیکٹریوں کے مالک تھے اور صدر آفس جہاں قمر پرنسٹنٹ

تھا۔ وہیں ان کا دفتر تھا۔

بند روڈ میں بھی ایک آفس تھا۔ اسی آفس میں ناصر کو بطور مینیجر کام کر

تھا۔ اس کو بیٹے میں چار دن انکیشن کرنا تھا۔

آفس کے شاف سے قمر نے ناصر کا تعارف کرایا۔ مینیجر کی کرسی خالی تھی

کیونکہ پہلا مینیجر زوج میں چلا گیا تھا۔ شاف میں آدھی لڑکیاں تھیں۔ ٹائیسٹ

ایک سیکرٹری۔ اکاؤنٹ ایک بوڑھا سا آدمی تھا جس کی کچھڑی سی داڑھی تھی

اور کچھ لڑکے کلرک تھے۔ ناصر کا پہلا ہی بھی ایک بوڑھا سا خبطی آدمی تھا۔

جنگے پاؤں جگر لگا رہی ہیں۔ میلاد شریف یا نذر نیاز پر دوپٹے پھیلا پھیلا کر خدا سے دعا کر رہی ہیں۔۔۔ یا الہی۔ یا مولا۔ میرے معبود، میری شادی قرمیاں سے کرا دو۔۔۔

”توبہ خدایا۔“ رقیہ درمیان میں بول پڑی۔ ”میں نے تو آپ کو دیکھا بھی نہیں تھا۔“

اور ناصر ان دونوں کی لڑائی میں بڑا لطف لے رہا تھا۔  
قرنے پھر وار کیا۔

”اب ناصر بھائی میں آپ کو کیسے بتاؤں منہ زیب نہیں دیتا۔ پر تم کون سے خیر ہو کے دیتا ہوں۔ خدا ان لڑکیوں کو سمجھ۔ میں ایک دن ان کے گھر گیا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں بڑا شرمیلا ہوں۔ آنکھیں جھکا کر بیٹھتا ہوں۔ تو میاں ان کے گھر میں ایک پتھر ادھر سے آ رہا ہے۔ کوئی سا بڑا دوازی ادھر سے بھانک رہی ہے۔ میرا تو شرم سے یہ خیال کہ بس زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔“

زمین میں۔“ ناصر نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔  
”منخرے بس کرو۔“ ناصر نے کہا۔

رقیہ تقریباً ”رہ پائی ہو کر بولی۔“ بی ہاں ہم پر الزام لگاتے ہیں اور خود ایک جگہ پر آنکھیں پٹکی نہیں تھیں۔ تاک بھانک لگی رہتی تھی۔“  
”میں سب جانتا ہوں۔ بھائی یہ بڑے حضرت ہیں۔“ ناصر نے کما رقیہ برتن اٹھانے لگی تو ناصر نے کہا۔ ”ایک نوکر کیوں نہیں رکھ دیتا۔ بھائی کو“  
میں نے تو مت کہتا تھا لیکن یہ کفایت شعار بست ہیں۔ کتنی ہیں گھر میں دل نہیں لگے گا بچر۔“

”اچھا“ پھر بھائی آپ کس وقت جا رہی ہیں۔“

”چار بجے جاؤں گی۔“

”اور پھر تباہ کی واپسی کب تک ہوگی؟“ قرنے پوچھا۔

”شام کو لینے آ جائیے گا۔“

”سر کے بل آئیں گے۔ گویا اب ہم چراہی بھی ہو گئے۔“

”توبہ خدایا۔ آپ سے تو کوئی بات بھی نہ کرے۔“

”آجائیں گے بھائی فکر نہ کریں۔۔۔ اور ہاں قمر جاؤ بھائی کو چھوڑ آؤ۔“

”جی نہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ قمر کا گھر پر رہنا ٹھیک ہے۔ آخر میرے لیے ہائے کون بنائے گا۔“ ناصر نے مسکرا کر کہا۔

”اور کیا ہو۔“ ناصر مسکرایا۔

”اچھا ہا“

”جو مزاج یا ہر میں آئے۔“

قرنے کہا۔

☆☆☆

ناصر کے جانے کا اکبر علی کو بہت رنج تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ اس کی نادانی پر فخر بھی تھا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ ناصر بے وقوف ہے۔ ٹھوکریں کھا کر واپس آ جائے گا لیکن نسرین کو کچھ پروا نہیں تھی۔

وہ اپنے پروگراموں میں مگن تھی۔ بچے کی پیدائش نزدیک آ رہی تھی اور اس کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ لیکن اسے کچھ خیال نہ تھا اکبر علی سے وہ باتیں کرتی۔ اکبر علی اسے احتیاط کے لیے کہتے لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتی۔

اکبر علی چاہتے تھے کہ وہ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں اپنے والدین کے پاس چلی جائے لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔

اکبر علی کو یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ نسرین ناصر سے بالکل محبت نہیں کرتی۔

اس کے گھر سے چلے جانے کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا، بلکہ کچھ ہنگامے اور بڑھ گئے۔ سیلیوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے دوستوں کا بھی اضافہ ہوا تھا۔

اسی رات دیر تک ڈرانگ روم سے کھانے کی آوازیں آتی رہیں اور اکبر علی بے چین تھے۔ اس وقت وہ چپ ہو گئے لیکن صبح انہوں نے نسرین سے کہہ ہی دیا۔

لیکن نسرین۔ اس کے دماغ میں ایک ہی دھن سائی ہوئی تھی وہ اس وقت تو اکبر علی کی بزرگی کا لحاظ کر گئی۔ لیکن یہ بات، یہ روک ٹوک اسے بری لگی۔ ناصر کے ساتھ تو اس کا دل لگا ہی نہ تھا۔ کچھ عرصہ جب وہ نئی تھی اور ناصر ایک مرد تھا۔ ایک وجہیہ مرد۔ وہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے محبت کرنی چاہی لیکن دو متضاد چیزیں کشش نہ پیدا کر سکیں۔ ناصر کے خیالات جدا۔ اس کے خیالات جدا۔ پھر نہ وہ ناصر کے خیالات کے مطابق بن سکی اور نہ ناصر اپنے آپ کو بدل سکا۔

نسرین کا دل بیزار ہو گیا اور وہ اپنے جذبات کی تسکین ہو ٹل، کلب اور اس قسم کی سوسائٹیوں میں کرنے لگی۔

نسرین نئی تہذیب کی دلدادہ تھی، بد چلن نہ تھی۔ وہ اپنا روپیہ خرچ کرتی اور سوسائٹی کی جان بنتی۔ نسرین کی یہ عادت پختہ ہو چکی تھی کہ وہ اپنی تعریف سننے میں بہت خوش رہتی اور اب تو وہ اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتی۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سوسائٹی اس کو پاکدامن نہ رہنے دے گی۔

ہر طرف بھوکے نظریں اس پر پڑتیں۔

لیکن نگلی ان نظروں کو سمجھتے ہوئے بھی انجیان بنی رہی۔

ناصر کے جانے کا اس پر کوئی اثر نہ تھا بلکہ ایک حد تک اس کی کوفت سی ختم ہو گئی تھی۔ ناصر کے رہنے سے بور سی رہتی۔

ناصر کا بچہ اس کی آنکھوں میں کلکتا رہتا۔۔۔۔۔ اسکا دل چاہتا تھا کہ اس بچے کو پیدا ہوتے ہی مار دے۔ بچے کے لئے اس کے دل میں کوئی امنگ نہ تھی نہ ہی وہ کوئی تیاری کر رہی تھی بلکہ لیڈی ڈاکٹر سے حساب ہی پوچھتی رہتی تاکہ وہ جلد اس حالت سے چھٹکارا پائے۔ آج کل اس نے باہر جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب وہ بڑی ہی عجیب نظر آتی تھی۔

اکبر علی کو ناصر بہت یاد آتا۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا لیکن کچھ پتہ نہ مل سکا۔

لیکن نسرین پر کچھ اثر ہی نہ ہوا تھا۔

اور پھر ایک صبح اس نے ہسپتال میں ایک منضی بچی کو جنم دیا۔ لڑکی ہو ہو امیر کی شکل کی تھی۔

اکبر علی بڑے رنجیدہ تھے۔ بیٹے کی کمی وہ بری طرح محسوس کر رہے تھے۔

اور نسرین ڈاکٹر سے پوچھ رہی تھی کہ ہسپتال سے کب چھٹکارا پائے گی۔

○



لے۔ ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔" قمر کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔  
 "تو تمہارا منہ کیوں لٹک گیا ہے۔" ناصر مسکرایا۔  
 "لیکن کیا۔ اماں بھیج دو۔ آخر وہاں جانا بھی تو ضروری ہے۔"  
 "ہاں بھیجنا ہی پڑے گا۔" قمر کے منہ پر واقعی اداسی آگئی۔  
 اور ناصر کو احساس ہوئے لگا۔ واقعی قمر کو رقیہ سے محبت ہے۔  
 "کب ہے شادی؟"



"کل سے شروع ہے۔ ایک ہفتہ پہلے ہی بلا رہے ہیں۔" قمر نے جھلٹاتے ہوئے کہا۔

"صبر اچھی چیز ہے۔ حوصلہ رکھو۔ اتنے دن کی تو بات ہے۔"  
 ناصر کی سیکرٹری مس گلوریا مسکرا رہی تھیں۔ ناصر نے اسے کہہ دیا کہ باقی کام کل کروائے گا۔ مس گلوریا اپنے کہین میں چلی گئی۔ اور قمر اس کی بل کھاتی ہوئی کمر کو دیکھ کر بولا۔ "لڑکی یہ بھی بری نہیں۔"  
 "اچھا ابھی تو رو رہے تھے بھابی کے لئے اور اب اس لڑکی کی تعریف ہو رہی ہے۔" ناصر ہنستے ہوئے بولا۔

اور واقعی جینپ گیا۔ "یونی منہ سے نکل گیا۔"  
 "جی ہاں، آپ کی ان باتوں سے تو ہماری ذات بدنام ہو کر رہ گئی ہے۔"  
 "ذات۔" قمر نے حیرت سے پوچھا۔  
 "جی ہاں، مردوں کی ذات۔"

"کاش تم عورت ہوتے۔" قمر نے بڑی حسرت سے کہا۔  
 "پھر کیا ہوتا؟"

"پھر میں تم سے شادی کر لیتا۔"  
 اور ناصر نے تھقہ لگایا۔ "اچھا۔"  
 "چلو گھر۔" قمر درمیان میں بول اٹھا۔  
 "وہ کیوں؟"

"اماں چلو، حقیقتیں نہ پوچھا کرو۔"

ناصر کا سروس کا پہلا موقع تھا لیکن پھر بھی اس نے چند ایک دشواریوں کے بعد دفتر پر قابو پایا تھا۔

اور پھر ایک ماہ کے قلیل عرصے ہی میں وہ اپنے عملے کے دل میں گھر کر گیا۔ عملہ تو ایک طرف رہا، کاغذی صاحب بھی بہت خوش تھے۔  
 تمام ٹیکریوں میں وہ انکیشن کے لئے جاتا۔

اور سچ بات تو یہ تھی کہ ناصر واقعی محنت کر رہا تھا۔ اکثر وہ دفتر کے مائم کے بعد بھی بیٹھا کام کرتا رہتا۔

اور قمر کو تو اس سے بڑی شکایت تھی کہ اس نے ان کاموں میں اپنے آپ کو اتنا کیوں الجھا لیا ہے لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتا۔  
 "اسم کو وہ رقیہ کو سیر کرانے لے جاتے۔ کبھی کبچر کا پروگرام بناتا اور کبھی سیر کا۔"

ناصر کو دفتر بہت دور پڑتا تھا۔ اس کے لئے وہ چاہتا تھا کہ وہ کہیں نزدیک ہی فلیٹ لے لے اور پگڑی کی رقم کے بغیر مکان ملنا محال تھا۔ دوسرے قمر بھی نہیں چاہتا تھا کہ ناصر علیحدہ رہے اور پھر ناصر نے سکوٹر خرید لیا۔

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔  
 ناصر دفتر میں بیٹھا اپنی سیکرٹری سے کچھ خط لکھوا رہا تھا کہ قمر پر نظر پڑی۔  
 "تم خیریت؟"

"خیریت ہے یار تمہاری بھابی کے بچا محترم آئے ہیں ان کو لے جانے کے

ہوئے کہا۔

”وہ تمہارے سر محترم بیٹھے ہوئے ہیں۔ اپنے شریلے داماد سے کیا کہیں گے اب۔“

رقیہ نے کھانا دسترخوان پر چن دیا۔۔

اور چچا صاحب جو کہ بڑے مزے کے آدمی تھے۔ ہاتھ دھو کر سب سے پہلے دسترخوان پر آ بیٹھے۔

ناصر اور قمر بھی آگئے اور کھانے لگے۔

”اچھا تو بیٹا۔ تم لوگ بھی چلتے ہو نا؟“

”جی نہیں، ہمیں چھٹی نہیں ملتی چچا جان۔“ قمر نے جواب دیا۔

”وہ دن کی لے لو۔ آخر کلام تم لوگوں نے ہی کرنا۔ وہ۔ ناصر بیٹا میری

خاطر دو دن کی چھٹی لے لے۔“

”جی ہاں۔ مگر نہ کریں۔ ہم بیٹے کی بھی لیں گے اور اتوار تو اپنا ہی

ہے۔“

”ہاں ٹیپ بننا۔ رقیہ تو آج میرے ساتھ چلتی ہیں۔“

”جی ہاں۔“

قمر جیسے بہت دور سے بول رہا تھا۔

اور ناصر کو ٹیپ آ رہی تھی۔

☆☆☆

اور ناصر چچ چھٹی ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے قمر کے ساتھ چلا آیا۔

رقیہ کے چچا بیٹھے تھے اور رقیہ اپنے کپڑے بس میں رکھ رہی تھی۔

”اچھا آپ ہیں ناصر میاں۔“ چچا نے ٹیک کے شیشوں میں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”جی آداب بھالانا ہوں۔“

”بیٹے رہو، بیٹے رہو۔ بیٹھو میاں۔ تم سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔

قرآن دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر بچکے سے کھٹک گیا اور رقیہ کی شامت آ گئی۔

”اچھا، تو تم جا رہی ہو۔“

”نہ جاؤں کیا۔“ رقیہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”جاؤ، کون روکتا ہے۔“

”آپ کہیں تو نہ جاؤں۔“

”جاؤ۔ پر ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا۔“

”آپ اور ناصر بھائی بھی تو آئیں گے نا؟“

”ہم بیٹے کو آئیں گے اور اتوار کو واپس۔“

”تو میں بھی ساتھ آ جاؤں گی۔“

”میرا دل چاہتا ہے چھٹی لے کر میں بھی چلوں۔“

”کیوں؟“ رقیہ ہنس دی۔

اور قمر نے رقیہ کے بال کھینچ لئے۔ ”تم نہیں جانتی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ اس نے اس کی انگلیوں کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

”ارے بھئی، نوشہ میاں۔ کہاں غائب ہو گئے۔ رقیہ ناصر کی آواز سن کر

بھاگ گئے گی۔

”بڑے نامعقول آدمی ہو۔ ہر وقت آپٹکتے ہو۔“ قمر نے چہرے پر غصہ لاتے

چہنے کے دن ناصر اور قمر شادی پر چلے گئے۔ چچا جان بڑے بھلے انسان تھے۔ قمر کو تو باہر کے کلاؤں پر مامور کر دیا اور ناصر کو گھر میں ہی۔ قمر ناصر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا اور ناصر ہنسنے لگا۔

گھر میں خوب چل چل تھی۔ بچوں کی فتح پکار۔ مہمان آرہے تھے۔ شام کو برات آئی تھی۔ گھر کو رنگ رنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ناصر گھر سے لی ہوئی بیشک میں بیضا دعوت کے کارڈ لکھ لکھ کر بھجوا رہا تھا اور پچا جان مع فرشی حقہ کے بیٹھے کھوا رہے تھے۔  
دوپہر کو کھانا آیا۔ پچا جان اور ناصر نے مل کر کھایا اور پھر سد پھر کو قمر بھی آگیا۔ اس وقت پچا جان اندر جا چکے تھے۔

قمر جل کر بولا۔ ”تو اندر کے کاموں میں آپ حصہ لے رہے ہیں؟“

ناصر بے پروائی سی بولا۔ ”جی ہاں۔ آپ کو اعتراض؟“

’خوب عورتیں آئی ہوں گی۔“

”مجھے اس سے کیا غرض؟“

”ہوں۔ بھلا غرض ہے تمہیں۔“

”میں تمہاری طرح غذا نہیں کہ تاک بھانک کرتا پھروں۔“

”تو میں غذا ہوں کیا؟“

”پھر پوچھ کیوں رہے ہو؟“

”ڈیوٹی بدل لو میرے یار۔“ یکایک قمر نے پہلو بدل لیا۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔“

ناصر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”اچھا یہ تاؤ رقیہ نے کیسے کپڑے پہنے ہیں؟“

ناصر قہقہہ لگا کر بولا۔ ”یار۔ تم تو جی جی جل گئے ہو۔“

اسنے میں پچا جان آگئے۔ انہوں نے آتے ہی ناصر سے کہا۔

”بیٹا ناصر۔ تمہیں رقیہ بلا رہی ہیں۔“

قمر نے پھر بولکائی نظروں سے ناصر کو دیکھا۔

ناصر نے قمر سے کہا۔ ”تم یہ کچھ دعوت نامے رگے گئے ہیں۔ لکھ لو میں ابھی آتا ہوں۔“

قمر جھپٹا کر بولا۔ ”بھئی‘ اب تم ہی لکھ لو میں سن لیتا ہوں کیا بات ہے۔“

”نہیں تمہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ناصر اس کو اور ستا رہا تھا۔ ناصر ہنستا ہوا زانے حصے کی طرف چلا گیا۔

ڈیوڑھی میں پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا تاکہ رقیہ کو بلوائے لیکن ڈیوڑھی کے ساتھ ہی جھونے کمرے سے کچھ خوشگوار سی آوازیں سن کر وہ گھبرا گیا۔

اس سے بیشتر کہ وہ رقیہ کو بلوائے۔ کمرے میں سے ایک روشنی سی ہوئی جس نے اس کی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ ایک بچلی سی کوندی جو ناصر کو جھنجھوڑ کر رکھ گئی۔ وہ بت بنا ہوا اسے دیکھتا رہا۔ شہری کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک مرمیں جسم اس کے سامنے تھا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا۔

ناصر اپنی حالت سے چکا تو وہ لڑی گھبرا کر واپس پٹ رنی تھی۔

”سنئے۔“ ناصر اپنے حواس ٹھیک کر کے بولا۔

مجسمہ پلٹ گیا لیکن شرابا ہوا۔ ایک بوجھ سے دبی ہوئی پلکیں۔

”زرا رقیہ بھائی کو بلا دیجئے۔“

اور پھر مجسمے کو جیسے پر لگ گئے۔ وہ یوں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کہ جیسے محض نظر کا دھوکہ ہو۔

ناصر اب تک مدہوش سا تھا کہ رقیہ آگئی۔

”بھائی جان۔ میں نے دو تین مرتبہ بلایا، آپ کہاں تھے؟“

”کہیں نہیں بھائی۔ بیس پر تھا۔“

”بھائی جان۔ میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ نے آج بیس پر رہتا ہے؟“

”جیسے آپ کہیں بھائی۔“

”بیس رہنے نا۔ اب اتنی دور کہاں جائیں گے۔“

”اچھا تو آپ چلیں، میں چائے بھجواتی ہوں۔“

ناصر کی نظریں بھگ سی رہی تھیں۔ اسی مجسمے کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن وہ واپس لوٹ آیا۔ اور مجسمہ اسے نظر نہ آ سکا۔

قمر پہلے ہی جلا بیٹھا تھا۔

”کتنی دیر لگائی تم نے؟“ وہ غصے سے بولا۔

”بھائی کہہ رہی تھیں کہ میں بیٹھ کر چائے پیو لیکن مجھے تمہارا خیال آگیا۔“

”کیوں؟“ قمر جل ہی تو گیا۔

”تو پھر پی لیتے یہاں کیوں آگئے۔“ وہ اسی لمحے میں بولا۔

”وہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔ میں تو گھبرا گیا۔“

”جہاں میں لڑکیاں دیکھیں سریش ہو گئے۔“

”اما چائے لے آئی۔“

اور پھر ناصر اسی حسین مجھے میں کو گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اے

سین معصوم چہرہ دیکھا تھا۔

”اور پھر اس کے دل میں کئی ناقص باتیں ابھرنے لگیں۔“

”اور آخر اس نے قمر سے پوچھ ہی لیا۔“

”جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے اس سے چھوٹی بھی کوئی بہن ہے کیا؟“

”نہیں وہ سب سے چھوٹی ہے۔ جس کی شادی ہو رہی ہے۔“

قمر نے جواب دیا۔

”کیا تم شادی کرنا چاہتے ہو؟“ قمر نے مسکرا کر دریافت کیا۔

”نہیں۔“

”پھر۔“

”یونہی۔“

”کچھ تو ہو گا آخر؟“

”بھئی کچھ نہیں کہہ دو یا۔“

”کسی کو دیکھ آئے ہو کیا؟“

”تمہیں کیوں بتاؤں؟“

”اچھا پھر تو ضرور کہیں دل دے آئے ہو۔“

”پھر تمہیں غرض؟“

”ایسا نہ ہو کہ جو تے پڑ جائیں۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”مجھ سے بھی چمچاؤ گے۔ بتاؤ شاید کچھ کام بن جائے۔“

اور ناصر نے سوچا واقعی قمر کو بتانا چاہئے کہ وہ کون تھی۔ پتہ تو چل سکے گا اور اگر میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تو زندگی زندگی ہوگی۔

”ورنہ۔“

”قمر۔“

”کو۔“

”بھئی کیا بتاؤ۔ ہم تو لٹ گئے ہیں۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسا حسن نہیں دیکھا۔ اس وقت سے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ہوش میں نہیں

ہوں۔ بس کیا بتاؤں۔“

”کون تھی وہ؟“ قمر نے مسکرا کر دریافت کیا۔

”اس کی تعریف نے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ نہ جانے وہ کون ہے۔“

میں خود نہیں جانتا لیکن مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ اگر اسے نہ پاس کا تو میری

زندگی میں خلا رہ جائے گا۔“ ناصر کھٹکے کے سارے لیٹ کر بولا۔

”بالکل فلی ڈا نیلاگ ہیں۔ کچھ ایسے الفاظ استعمال کرو۔“ قمر ہنس رہا تھا۔

”تم مذاق سمجھ رہے ہو۔“

”نہیں مذاق کہاں۔ سچ تو کہہ رہا ہوں۔ تم فلموں میں دیکھتے نہیں ہو۔ ادھر

ہیرو نے ہیروئن کو دیکھا تو فوراً تمہاری طرح کہنے لگے کہ میں اس کے بغیر زندہ

نہ رہ سکوں گا اور میری زندگی میں ایک خلا رہ جائے گا۔“

”تم مذاق سمجھ رہے ہو“ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک لمحے میں کیا سے کیا ہو

جاتا ہے۔ پہلی نظر ہی انسان کو برباد کرتی ہے۔ تم نے محبت کو مولی گا بڑ سمجھا ہے

کہ جو بھاؤ بنا تو ٹھیک ورنہ نہ سہی۔ پسند آنے والی چیز ایک ہی نظر میں کہہ دیتی

ہے کہ سب کچھ لٹاؤ مجھے حاصل کر لو۔“

”اچھا تم یہ بتاؤ۔ غنڈے تم ہو کہ میں۔“ قمر نے بدلہ لے لیا۔



ہیں۔

ایک دو اور بزرگ آگئے۔ چچا جان ان کے ساتھ شامیانے میں چلے گئے۔  
 قمر زناٹے حصے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ ناصر نے گردن پکڑ لی۔  
 ”کہاں بھی؟“

”وہ تمہاری بھالی بلا رہی ہیں ذرا۔“ وہ گردن چھڑاتے ہوئے بولا۔

”ہاں بھالی بلا رہی ہیں۔ ادھر آؤ۔ وہ دیکھو برات آ رہی ہے۔ آواز سنو۔“

اور واقعی فوجی بیٹن کی آواز قریب آ رہی تھی۔ ناصر، قمر اور چچا میں باہر  
 سڑک پر برات کے استقبال کے لئے نکل آئے۔

اور چچوں پر بھاگ دوڑ مچ گئی۔ شاید حوا کی بیٹیوں نے وہاں قبضہ جمایا تھا۔  
 بچے بھاگنے لگے۔ قمر گردن موڑ موڑ کر اوپر دیکھ رہا تھا اور ناصر نے اس کو تھما  
 ہوا تھا۔ برات قریب آ گئی۔ چچا جان بزرگوں سے گلے ملنے لگے۔ ناصر اور قمر  
 دوہما کو اتارنے لگے۔

ملنے ملانے کے بعد دوہما کو اندر لے جایا گیا۔

ناصر کھانے کا انتظام دیکھنے لگا اور قمر براتیوں کی آؤ بھگت۔

ناصر کے دفتر کا ایک بوڑھا کلرک بھی وہاں موجود تھا۔ اپنے صاحب کو دیکھ  
 کر بولا۔ ”ناصر صاحب آپ۔“

”اوہو میر صاحب آپ۔ تشریف رکھئے۔“

گو وہ کلرک تھا لیکن ناصر اس کی بزرگی کی قدر کرتا تھا جس سے میر صاحب  
 کے دل میں ناصر صاحب کی بڑی عزت تھی۔

ناصر نے میر صاحب کو لے جا کر بٹھایا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

قمر جھلایا ہوا آیا اور بولا۔ ”بھئی ادھر آؤ۔“

”کیا بات ہے؟“

”چچا جان کا آرڈر ہے کہ نکاح کے بعد پہلے زناٹے حصے میں کھانا دیا  
 جائے۔“

”بھالی۔“

”کہنے۔“ رقیہ ناصر کے پاس آکھڑی ہوئی۔

اور ناصر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ رقیہ سے کیا کہے۔ اس نے تو  
 یونہی ٹھہرنے کے لئے اسے بلایا تھا۔

”وہ۔ وہ برات کس وقت آئے گی۔“ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

”آپ کو نہیں معلوم؟“ رقیہ ہنس پڑی۔

”جی۔ وہ۔ نہیں تو مجھے تو نہیں معلوم۔“ اپنی یوقنی پر وہ ہنسنے لگی۔

”آٹھ بجے رات کا ٹائم دیا ہے۔“ رقیہ نے سادگی سے جواب دیا۔

”اچھا۔ بھالی۔ وہ قمر تو اس طرف نہیں آیا؟“

”کئی مرتبہ آچکے ہیں۔“ رقیہ شراتے ہوئے کہنے لگی۔

”اچھا۔“ ناصر نے کہا۔ ”اور مجھ سے کہتا تھا کہ ایک مرتبہ بھی نہیں گیا۔“

رقیہ اور بھی شرما گئی۔ باتیں ختم ہو گئیں۔ ابھی ناصر کچھ اور باتیں کرنے  
 کے لئے جمع کر رہا تھا کہ ایک لڑکی رقیہ کو بلا کر لے گئی اور ناصر ادھر ادھر دیکھتا

ہوا واپس آئی۔

حسرتیں گھٹ کر رہ گئیں۔ تنہائیں چلتی رہ گئیں۔ ناصر نے آتے ہی غصہ

قمر پر اتارا۔ ”ہوں تو آپ اس طرف ایک مرتبہ بھی نہیں گئے۔“

”تو تمہیں پتہ چل گیا۔“ قمر زور سے ہنسا۔

چچا جان نے آ کر اور باتیں روک دیں اور اپنے ساتھ لے جا کر شامیانے  
 میں مزید دریاں بچھانے لگے۔

دو تین گھنٹے اسی مصروفیت میں بیت گئے۔

شام ہوتے ہی قمقمے جل اٹھے۔ رنگ برنگی روشیں پھیل گئیں۔ چل پھل

کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ چچا جان بھی اپنی سفید شروانی پہن آئے۔

ناصر اور قمر نے بھی کپڑے بدلے اور برات کا انتظار کرنے لگے۔

چچا جان چھڑی کپڑے ہوئے ادھر سے ادھر ٹھل رہے تھے۔ کبھی دلیوں کے  
 پاس جا کر چاؤل پکیتے۔ کبھی فرنی پر ورق لگوانے کو کہتے اور کبھی ناصر سے

”معنی۔“ ناصر بھائی لیتے ہوئے بولا۔  
 ”آئیے بھیا۔ آپ بہت تھک گئے ہیں۔“  
 ”مجھے کہیں جگہ مل سکے گی۔ سونے کے لئے، قمر تو سو گیا ہے شاید۔“  
 ”میرے ساتھ آئیے آپ۔“ رقیہ ناصر کو لے کر اوپر کی طرف چلی گئی۔  
 زینہ عبور کرنے کے بعد وہ ناصر کو ایسے کمرے میں لے آئی۔ جہاں شاید  
 نیز کا سامان رکھا تھا۔

”واقعی سکون تو ہے یہاں۔“ ناصر کمرے کو دیکھ کر بولا۔  
 ”اس پبلنگ پر سو جائیے۔ میں آپ کو چادر اور تکیہ بچھوا دیتی ہوں۔“  
 ”آپ کو تکلیف دی بھابی۔“  
 ”میں تکلیف تو آپ کو ہوئی۔“ رقیہ کشتی ہوئی بیچنے چلی گئی۔  
 پبلنگ شاید جیز کا تھا اور سارا کمرہ نئی نئی چیزوں اور فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔  
 ناصر سوچنے لگا۔ یہ جیز کی رسم کشتی فرسودہ ہے۔

ایک تو پلی پلائی لڑکی دی جائے اور پھر اتنا خرچ اور اس پر یہ کہ گھر کا تمام  
 سامان۔ تو یہ اگر کسی کی چار پانچ لڑکیاں ہوں تو وہ بے چارہ تو بے موت سر گیا۔  
 رقیہ چادر اور تکیہ لے آئی اور ناصر جی بجا کر سونے کے لئے لیٹ گیا۔  
 مری کچھ زیادہ تھی۔ اس لئے اس نے کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے اور آ  
 کر لیٹ گیا۔

تھکا ہوا تھا لیٹتے ہی سو گیا۔  
 رات گئے تک ڈھونک بجتی رہی اور پھر تین بجے رات کو لڑکیاں انھیں  
 اور جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گئیں۔

جس کمرے میں ناصر سو رہا تھا۔ اس سے ملے ہوئے کمرے میں کئی لڑکیاں  
 آ کر سو رہیں۔ اور اس اندر سے میں بھی ناصر کے کمرے میں ایک سایہ ابھرا  
 اور اندر سے میں نڈتا ہوا ہاتھ پبلنگ پر پڑ گیا۔ اتفاق سے ناصر اس وقت کوٹ  
 ہلے ہوئے تھا اور سایہ وہیں پبلنگ پر لیٹ گیا۔  
 ناصر کچی نیند میں تھا۔ اس زلزلے سے جاگ اٹھا اور سایہ بھی چوٹک گیا۔

”تو کہ بس زنانے حصے کی فکر ہے۔ بھی انتظام بڑا وسیع ہے۔ بیک وقت  
 زنانے اور مردانے میں کھانا دیا جاسکتا ہے۔ تم ان لڑکوں سے کام لو۔“ ناصر نے  
 خاندان کے لڑکوں کی طرف اشارہ کیا جو دیگر کاموں میں مصروف تھے۔ چچا جان  
 ایسے موقع پر بوکھلا جایا کرتے تھے۔ وہ گھبرائے ہوئے آئے۔  
 ”بیٹا۔“

”گھبرائیے نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ناصر نے انھیں گھبرایا ہوا دیکھ  
 کر کہا۔  
 اور پھر نکاح کے بعد ناصر، قمر اور دوسرے لڑکے کھانا کھلانے میں لگ  
 گئے۔  
 کھانا کھلانے میں لگ گئے۔

ناصر کا حسن انتظام بہت ہی اچھا تھا اور بیک وقت دونوں حصوں میں اچھی  
 طرح کھانا دیا گیا۔  
 ناصر جس وقت کھانا دے رہا تھا اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں  
 لیکن جس کی اسے تلاش تھی وہ نظر نہ آئی۔  
 اور پھر خدا خدا کر کے ناصر کو فراغت حاصل ہوئی۔ برات نے رات کو  
 رہنا تھا۔ صبح دہلیز کی رخصتی تھی۔

رات دس بجے کئی مہمان رخصت ہو گئے۔ جو یہیں پر تھے۔ ان کے رہنے  
 کا انتظام شایانے میں کر دیا گیا تھا۔  
 سب جگہ لوگ ہی لوگ تھے۔ ناصر کو کہیں جگہ نہ ملی تھی کہ وہ سوئے اور  
 قمر تو اندر کی بیٹھک میں سو گیا تھا شاید۔

ناصر بری طرح تھک چکا تھا۔ وہ آخر جمائیاں لیتا ہوا زنانہ حصے کی جانب  
 بڑھا اور رقیہ کو بلایا۔ زنانے حصے میں شاید کسی کو نیند نہ آ رہی تھی۔ ڈھونک بچ  
 رہی تھی اور ڈھونک کی تھاپ پر سر پلے کیت فضا میں بھی غنودگی سی پیدا کر رہے  
 تھے۔

ناصر سمجھا کہ قمر اسے تنگ کرنے آیا ہے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر سامنے کو گردن سے پکڑ لیا اور بولا۔

”تو تم مجھے سوئے نہیں دو گے۔“

اور ایک ہلکی سی چیخ ابھری۔ ناصر نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھ کر جلدی سے قتل جاتی۔

اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سنہری کپڑوں والا مجسمہ اس کے پلنگ کے پاس کھڑا تھا۔

وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ ”آپ۔“

اور پھر ایک بار وہی پلکیں اٹھیں اور ناصر تھرتھرا گیا۔

”معاف کیجئے۔ میں سمجھا شاید قمر ہے۔“ ناصر معذرت کرتے ہوئے بولا۔

مجسمہ چپ رہا۔

ناصر اسے پرستش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک وہ چونک کر بولا۔

”آپ سونا چاہیں تو میں نیچے چلا جاؤں گا۔“

”نہیں نہیں۔“

”تو پھر؟“

مجسمے میں حرکت آگئی اور وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

”نہئے۔“

وہ وہیں کھڑی ہو گئی۔

”آپ سو جائیں میں نیچے چلا جاتا ہوں۔“

”کیس پر جبکہ نہیں۔“ پہلی مرتبہ ناصر نے اس کی آواز اچھی طرح سنی

آواز اس سے زیادہ دلکش تھی۔

”پھر آپ کہاں سوئیں گی؟“

”میں نہیں۔ آپ سو جائیے۔ تین تو بج گئے ہیں۔۔۔۔۔ باقی رات میں

بیٹھ کر نکال لوں گا۔“

”آپ سو جائیں۔“ اور وہ کمرے سے نکل گئی۔

اور ناصر دیکھتا رہ گیا اور ان خوشگوار لمحات کو یاد کرنے لگا۔

جتنی بچا کر وہ پلنگ پر آ لیتا اور وہ سگریٹ سلگا کر سو پڑتا۔ یہ کون ہے۔

وہ اس کے ہلکوتی حسن کی بے پناہ کشش سے مسموم ہو چکا تھا۔

اور اس کی رگ و پے میں ایک تڑپ بن کر سامنے تھی۔ اس کو ہمیشہ اپنا لینے کی شدید خواہش دل و دماغ کی تھیں جنم لینے لگی اور پھر کچھ دیر پہلے کی منتکوا سے یاد آگئی۔

خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش مزاج اور بات کرنے کا لہجہ بے حد بار تھا۔

جب اس نے مسکرا کر ناصر سے کہا تھا کہ جبکہ تو کہیں بھی نہیں تو ناصر کو یاد آیا کہ اس وقت سفید سفید دانتوں کی خوش نما لڑی نکلتا کی طرح پیاری تھی۔

اس کی مدھ بھری آواز میں قدرتی لوچ تھا۔

اور جب وہ چھوٹے چھوٹے پنپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہی تھی تو ایسا ہو رہا تھا جیسے پانی کی سطح پر چل رہی ہو اور ہر لمحہ ڈوبنے کا خوف ہو۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ناصر کو یاد تھیں۔ جن میں بے پناہ کشش تھی اور دراز

پلکیں ان کا حسن سمیٹے ہوئے تھیں۔ کالے لمبے بالوں کی ایک چوٹی کمر پر بھول رہی تھی۔ وہ مجسم قیامت تھی۔

ناصر کو دنیا کی تمام خوبیاں اس میں نظر آ رہی تھیں۔

اور پھر وہ بالکل نہ سو سکا بلکہ اس خیال کو اپنے دل میں گہری جگہ دینے لگا۔

صبح کی روشنی نمودار ہوئی۔ نیچے سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ شاید گھر والے جاگ گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ نیچے چلا جائے لیکن اس کمرے سے کچھ

امیدیں وابستہ تھیں۔

اور پھر وہی شور مچ گیا۔ زندگی جاگ گئی۔

رقیبہ نے آکر ناصر سے کہا۔ ”آئیے بیجا۔ ناشتہ کر لیں۔“

اور آخر وہ رقیبہ کے ساتھ چپ چاپ چلا آیا۔



قمر بھی جاگا ہوا تھا۔ ”تم کہاں تھے؟“

”ادھر سو رہا تھا۔“

”اچھا“ میں تو تم کو چھوڑ کر آگیا تھا تاکہ تمہیں کہیں جگہ نہ ملے، مگر تمہارے نصیب۔“

”جی ہاں“ مجھے بڑا اچھا لنگ ملا اور۔ اور پھر۔“ ناصر نے جان بوجھ کر فقرو اور چھوڑ دیا۔

”پھر کیا؟“ قمر تشویش میں تھا۔

”پھر چلو۔ اب ناشتہ کریں۔“

”جتاؤ نا۔ کیا ہوا؟“

”کچھ نہ پوچھو۔“ ناصر کو رات کا قصہ یاد آیا۔

”نہ بتاؤ۔“ قمر روٹھ گیا۔

”بتا دوں گا۔ حوصلہ رکھو۔“

ناشتے کے بعد جیز وغیرہ رکھا جانے لگا۔ جیز کے پنگ کو دیکھ کر ناصر کو اپنے دل میں ایک خوشگوار سی دھڑکن کا احساس ہوا۔

”قمر اس پنگ کو دیکھ رہے ہو۔“ ناصر نے قمر کو ٹھوکا دے کر پوچھا۔

”ہاں، کیا خوبی ہے اس میں۔“ قمر نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”تم کیا جانتو؟“ ناصر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”تم بتا دو۔“

”اس پر رات کو وہ بیٹی تھیں۔“

”کون؟“ قمر اٹھل کر بولا۔

”تمہاری بھائی۔“

”ہیں کیا کہہ رہے ہو۔“

اور پھر ناصر نے سارا قصہ سنایا تو قمر ہنس کر بولا۔ ”تم گئے اب ہاتھ۔“

”۔۔۔“

”قمر تم بھائی سے کہو۔ کم از کم پتہ تو چل جائے وہ کون ہے؟“ ناصر فحشی

لگا ہوں سے نکلتا ہوا بولا۔

”ہم ان معلوماتوں میں نہیں پڑا کرتے برخوردار۔“ قمر منہ سکوڑتے ہوئے بولا۔

”بس پھر ہم تم سے نہیں بولیں گے۔“ ناصر بھی روٹھ گیا۔

”اس کے لئے ہماری کچھ شرطیں ہیں۔ اگر وہ تمہیں منظور ہوں تو غور کیا جاسکتا ہے تمہاری درخواست پر۔“ قمر نے کمال سنجیدگی سے کہا۔

”کیا شرطیں ہیں؟“

”کل تم ہمیں فلم دکھاؤ گے۔ پھر اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھاؤ گے اور سب سے بڑی شرط۔۔۔ جب ہم اور آپ کی بھابی رقیہ بیٹھے باتیں کر رہے ہوں تو آپ کبھی اس طرف نہیں آئیں گے۔“

”جی ہاں۔“

ناصر ہنستے ہوئے بولا۔

”منظور۔“

”ابھی کچھ اور ہیں۔“

قمر نے کہا۔

”وہ بھی بکو۔“ ناصر ہنس کر بولا۔

”اس گھر سے کبھی نہیں جاؤ گے۔ وقت پر گھر آؤ گے۔ اپنی سیکرٹری مس گوریہ سے ہمارا تعارف کرواؤ گے۔“

”بھابی سے جوتے پڑاؤ گے۔ یہ بھی تو ساتھ کہو۔“ ناصر درمیان میں بول اٹھا۔

”اس کی تمہیں خبر نہیں ہوگی۔“

قمر نے کہا۔

چچا جان نے آکر باتیں ختم کروا دیں۔

رخصتی کا وقت ہو گیا تھا۔ دلہن کو رخصت کروا کر موڑ میں بٹھایا گیا اور بیٹز کی آواز میں دلہن رخصت ہوئی۔ قمر کا منہ بھی لٹکا ہوا تھا۔

ٹرننگ کرنے راولپنڈی جانا تھا۔ چہ ماہ کی ٹرننگ تھی اور اس کے بعد اسے ٹیکسز انچارج کی جگہ ملی تھی۔ قمر کا خیال تھا کہ وہ رقیہ کو ساتھ لے جائے اور ناصر کا خیال تھا کہ وہ رقیہ کو چھوڑ جائے۔

رقیہ بھی جانا چاہتی تھی اور پھر ناصر نے نہ روکا۔

”میں یہاں نہیں رہوں گا۔“ ناصر نے کہا۔

”وہ کیوں؟“ قمر نے حیرت سے پوچھا۔

”ایک تو یہ جگہ بہت دور ہے۔ دوسرا مجھے فلیٹ مل رہا ہے۔“

”اس وقت کہاں مل رہا ہے۔“

”وہ اپنے دفتر کے میر صاحب ہیں نا۔ ان کے سامنے والا آج ہی خالی ہو رہا ہے۔ دفتر کے قریب بھی ہے۔“

”تو پھر لو پنڈی سے آنے کے بعد ہم بھی وہیں واپس آ جائیں گے۔“

”اچھا تو میں آج ہی جا کر ایڈوانس دے دوں گا۔“

”بس ٹھیک ہے۔“

رقیہ اپنے سفر کی تیاری کرتی رہی۔ ناصر اور قمر فلیٹ دیکھنے چلے گئے۔ فلیٹ واقعی ہوادار تھا اور میر صاحب کا فلیٹ اور یہ بالکل ملے ہوئے تھے۔ دونوں کے دروازے ایک طرف تھے۔

ناصر کے فلیٹ کے تین کمرے تھے۔ ایک کمرہ تو بالکل میر صاحب کے کمرے

سے ملا ہوا تھا بلکہ ایک دروازہ مشترک تھا۔

بنانے والے نے واصل ایک ہی بتایا ہوگا لیکن مجبوری نے اس کے دو پورشن کر دیے تھے۔ باورچی خانہ کے ساتھ ہی ایک کھڑکی تھی جو میر صاحب کی طرف کھلتی تھی۔ دونوں پورشن علیحدہ ایک چھوٹی سی دیوار نے کر دیے تھے۔ ناصر نے میر صاحب کو پیشگی کرایہ دے دیا تاکہ وہ یہاں کے مالک سے مکان لے لیں۔

ناصر اور قمر اب اس آگے اور پھر وہ رات کو قمر اور رقیہ کو چھوڑنے نیشین گیا۔ کافی دیر تک رقیہ اس سے باتیں کرتی رہی۔ قمر بھی اس سے بچھڑنے کے

ناصر اسے دیکھ کر بولا۔ ”تم کیوں رو رہے ہو۔“

قمر منہ بورتے ہوئے بولا۔ ”جب میری شادی ہوئی۔ میں بھی یونہی رخصت ہوا تھا۔“

ناصر اس فقرے سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ”گویا بھابی کی بجائے تم رخصت ہوئے تھے۔“

”ہاں۔“ قمر وصال سے آنکھیں صاف کرتا ہوا آگے بڑھا۔

”اچھا تو وعدہ یاد ہے نا؟“ ناصر نے وعدہ یاد لایا۔

”دم لو۔ مرے کیوں جاتے ہو۔“

”قمر اندر گیا تو رقیہ نے کہا کہ وہ چوتھی کی رسم کے بعد گھر جائے گی۔

قمر نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر چچی کے سامنے ایک نہ چلی اور مجبوراً ناصر کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔

رقیہ کے نہ آنے سے کچھ یاد نہ رہا کہ ناصر سے اس نے کوئی وعدہ کیا تھا۔

بہر حال وہ چپ ہو گیا لیکن ناصر بے چین تھا۔

چوتھی کے بعد رقیہ بھی آگئی اور زندگی پھر اسی ڈگر پر چلنے لگی۔

ناصر نے قمر سے اپنے سوال کا جواب مانگا تو اس نے رقیہ سے ذکر کیا۔

رقیہ یاد کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”وہاں تو کئی لڑکیاں آئی تھیں نہ جانے آپ

کے کہہ رہے ہیں۔“

”اس نے سفری کپڑے پہن رکھے تھے۔“ قمر نے کہا۔

”نہ جانے کون تھی وہ۔“ شینہ نے بھی پیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایک وہ فوزیہ تھی میر صاحب کی بیٹی اور کئی ایک تھیں۔“ رقیہ نے کئی نام گنوا ڈالے۔

جب ناصر نے حلیہ بتایا تو رقیہ پھر بھی نہ پہچان سکی۔

ناصر مایوس ہو گیا۔ پھر بھی اسے رقیہ نے تسلی دی کہ وہ ضرور پتہ کر دے

گی لیکن ناصر کے دل میں وہ خیال دن بدن پختہ ہونے لگا تھا، لیکن وہ قمر کی

مزاحیہ باتوں میں ڈوبنے کی کوشش کرتا رہا اور اسی طرح وہ ماہ بیت گئے۔ اسے

ایک دن ایک عجیب واقعہ یہ ہوا کہ قمر کو ٹرننگ کے آرڈر مل گئے۔ اسے

خیال سے اداس تھا۔

جب تک گاڑی کھڑی رہی، وہ خط لکھنے اور اداس نہ رہنے کی تلقین کرنے رہے اور پھر گاڑی روانہ ہو گئی۔

تب ناصر تھا تھا کا سا لوٹ آیا۔ سامان بندھا رکھا تھا۔ ناصر کے پاس سامان کیا تھا۔ قمری کرسیاں، میز اور کچھ چارپائیاں وغیرہ پڑی تھیں جنہیں رقیہ باندھ گئی۔ ناصر نے سوچا کہ صبح اس مکان میں شفت کرے گا۔

اور وہ پڑ کر سو رہا۔ گھر سوتا لگ رہا تھا اور اس کے ساتھ اسے اپنے سونے دل کا احساس ہوا۔ اداسیاں بڑھنے لگیں۔

اور پھر وہ اداسیوں میں گم ہو گیا۔

”خوشیاں ابدی نہیں۔“

یہ سوچتا ہوا وہ سو گیا۔

○



میر صاحب نے ناصر کے نام مکان لے لیا تھا اور اس نے اپنا مختصر سامان بٹا دیا تھا۔ سامان چونکہ بالکل کم تھا جس میں اس کی اپنی ضرورت کی چیزیں بہت کم تھیں۔ اتنا عرصہ تو وہاں مزے سے رہ رہا تھا۔

چنانچہ وہ دفتر جانے کی بجائے بازار چلا گیا اور گھر کے لئے اپنے لئے سامان خرید لگا۔ پردے، دریاں، فرنیچر اور دوسری ضروریات زندگی کی چیزیں۔ آخر نئی زندگی جو شروع کرنی تھی۔ اپنا گھر بنانا تھا اور اپنا دل آباد کرنا تھا۔

کافی خرید و فروخت کے بعد اس نے میر صاحب کو فون کر کے دفتر سے بلایا اور سامان گھر بھیج دیا۔ خود ہوٹل چلا گیا۔ کھانا کھایا آکس کریم کھائی۔

اور پھر سہ پہر کو کلفٹن چلا گیا۔ یونہی گھومتا رہا۔ بیکار، اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ گھر جا کر اسے سامان کی بیشک کرنی چاہئے۔

شام کو بتیاں جلنے کے بعد وہ ٹیکسی لے کر اپنے قلیٹ آیا اور خلاف توقع گھر کو سجا سبایا دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

ڈرائنگ روم میں اس کے لائے ہوئے پردے سرسرا رہے تھے۔ فرش پر نئی درزی اور پھر کارنس پر خوب صورت چیزیں، صوفہ سیٹ نفاس سے رکھا ہوا تھا اور پھر وہ شیشیوں والی جار، جس میں رنگین مچھلیاں نہ جانے کہاں سے آئی تھیں۔ جار واقعی اس نے خریدنی تھی لیکن اس میں پانی اور پانی میں تیرتی ہوئی رنگین مچھلیاں کیسے آگئیں۔ ڈرائنگ روم سے ہٹ کر وہ اپنے کمرے میں گیا۔ بلیک پر بستر، ٹیبل پر گلاس اور صراحی کا اضافہ نہ جانے کیسے ہو گیا تھا۔

تھی۔ میں نے اسے ماں بن کر پالا ہے۔“ بوڑھے میر صاحب نے اپنی داستان دہرا دی۔

”اچھا۔“ ناصر کو ذرا دلچسپی ہوئی۔

”ہاں بابو۔ میں اور میری بیٹی اس گھر میں رہتے ہیں، مدتوں سے۔“

”بابا۔“ اور دروازے کی دنگ کے ساتھ ایک آواز گونجی اور ناصر کو یوں محسوس ہوا جیسے ہلترنگ بنگ اٹھا ہو۔

لیکن وہ اپنے سینے کو خالی سا پا رہا تھا۔ اس کا دل تو اس دن ہی اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ جب رقیہ کا چچا زاد بہن کی شادی تھی۔

میر صاحب دروازہ کھول کر اس طرف چلے گئے اور پھر تھوڑی دیر میں کھانا لے کر آگئے۔

سادہ سا کھانا ناصر کو بہت پسند آیا۔

”آپ کی صاحبزادی کو بڑی تکلیف ہوئی میری وجہ سے۔“ ناصر نے کہا۔

”جی نہیں تکلیف کی کیا بات ہے۔ ہمیں تو بڑی خوشی ہے کہ آپ ہمارے گھر آ گئے ہیں۔ کچھ خدمت کا موقع ملے گا۔“

”میر صاحب۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ اس قسم کے الفاظ نہ نکالئے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ دفتر کی بات دفتر میں رہی۔ یہاں آپ میرے بزرگ ہیں۔“

”خدا آپ کو سلامت رکھے۔“ میر صاحب دعائیں دیتے رہے۔

”آپ سونے سے پہلے دودھ پیتے ہیں۔“

”نہیں نہیں۔ اس کی مجھے ضرورت نہیں۔“ ناصر نے کہا۔

”تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو کہہ دیجئے۔“

”میر صاحب۔ ایک اور تکلیف دوں گا آپ کو۔ میرے لئے کسی نوکر کا انتظام کر دیں۔ کھانا وغیرہ پکانے کے لئے۔“ ناصر نے کہا۔

”آپ فکر نہیں کیجئے۔ سب ہو جائے گا۔“ کافی دیر کے بعد میر صاحب گئے اور ناصر اسی جتنے کو خیالوں میں سمائے سو گیا۔

اور خوبصورت ٹیبل لیپ اور میز پوش کے پھول دیکھ کر تو اسے یہ احساس ہوا کہ وہ کسی ظلم خانے میں آ گیا ہے اور جادو کے دیو نے بھرا بھرایا گھر دے دیا ہے۔ ان میں بیشتر چیزیں تو اس کی اپنی خریدی ہوئی تھیں لیکن چند ایک چیزیں مچھلیاں، میز پوش، گلاس، صراحی یہ تو اس کی نہ تھیں۔

ایک دن میں سارا گھر کا گھر سیٹ ہو گیا تھا اور تو اور باورچی خانہ کا فرش بھی دھلا ہوا تھا اور وہاں بھی آئل سنڈو اور دوسری کئی ایک چیزیں نفاست سے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ حیران تھا اور ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ میر صاحب آگئے۔

ناصر اب تک یہ سمجھ رہا تھا کہ میر صاحب نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن جب میر صاحب بھی حیران رہ گئے تو وہ سمجھ نہ سکا یہ کیسے ہو گیا۔

”ارے آپ نے اتنی جلدی سیٹ بھی کر لیا مکان۔“ میر صاحب نے حیرت سے کہا۔

”مجھے تو کچھ پتہ نہیں میر صاحب۔ میں تو ابھی آ رہا ہوں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سب آپ نے کیا ہے۔“ ناصر واقعی حیرت میں تھا۔

”اچھا اب سمجھا۔“ میر صاحب مکرانے لگے۔

اور ناصر اب بھی پریشان تھا۔ ”کیا سمجھے میر صاحب۔ مجھے بھی تو سمجھائیے۔“

”ہوں۔“ بگلی ”میر صاحب ہنس دیئے۔

ناصر نے سمجھا کہ میر صاحب کا دماغ بھی اس ظلم خانے سے چکر ا گیا ہے۔ وہ صوفے پر اپنے آپ کو گرا کر کہنے لگا۔

”مجھے بھی تو بتائیے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں ناصر بابو۔ یہ فוזیہ نے سارا سامان سیٹ کر دیا ہے۔“

”فوزیہ؟ کون فوزیہ؟“ ناصر کو اور حیرت ہوئی۔

”میری بیٹی ہے بابو۔ ایک ہی بیٹی ہے میری۔ اس کی ماں بچپن میں مر گئی

”اچھا میاں۔ میں اب چلا دفتر، آپ تو بچے آئیں گے۔“

نوبچے کے قریب وہ تیار ہو کر دفتر آ گیا اور دفتر کے کام میں مگن ہو گیا۔  
کیا رہے قمر کا فون آیا کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے اور فی الحال ہوٹل میں مقیم  
ہے۔ پھر بیس میں جگہ مل جائے گی۔

اس کے بعد وہ انکیشن کے لئے نکل گیا۔ ٹیکسیاں چیک کرتا رہا۔ کاظمی  
صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بڑے خوش تھے اس پر۔ تقریباً تین بجے گھر واپس  
آیا۔ میر صاحب کھانا لے آئے۔

کھانے کے بعد اس نے میر صاحب سے کہا۔ ”میر صاحب۔ آپ کو بڑی  
تکلیف ہو رہی ہے میری وجہ سے۔ نوکر کا انتظام کر دیجئے۔ جب تک انتظام  
نہیں ہوتا میں ہوٹل میں اپنا انتظام کر لیتا ہوں۔“  
”نہیں“ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اگر آپ کو اعتراض ہے تو خرچ ملا  
لیجئے لیکن ہوٹل آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گا۔“

”لیکن آپ کی صاحبزادی؟“

”وہ سب جھوڑیے۔“ کافی اصرار کے بعد میر صاحب نے بچپاس روپے لئے  
اور ناصر کو کچھ اطمینان سا ہو گیا۔ کافی دیر تک وہ ایک انگریزی ناول پڑھتا رہا۔  
پھر سو گیا۔

دروازے کی دنگ سے آکھ کھلی تو گھڑی چھ بج رہی تھی۔ یہ دنگ کسی  
اچھی تھی اور کتنا احساس دلاتی تھی اسے۔ آج اس کا دل نہ چاہ رہا تھا کہ وہ باہر  
جائے۔ صحن میں آکر دیکھا تو سرخ سرخ گھلوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔  
دنگ سن کر وہ اندر گیا تو میز پر جانے رکھی ہوئی تھی۔ چائے پیتے پیتے وہ  
سوج رہا تھا۔ فوزیہ جھ سے اس جھٹکے کی یاد جھین لے گی۔ دونوں کو سامنے رکھ  
کر غور کرنے لگا تو جھٹکے کا پلڑا بھاری رہا۔

نہیں نہیں مجھ سے اسے نہیں بھول سکتا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ کپڑے  
بدلنے لگا۔ باہر آکر اس نے رکشائی اور بچا کے گھر چلا گیا۔

بچا جان نے بڑی آؤ بھٹک کی چچی فوراً چائے بنا لائیں۔ پاپڑ مل کر ساتھ

☆☆☆

ہلکی سی دنگ سن کر اس کی آنکھ کھلی۔ مسکراتا ہوا اٹھا اور غسل خانے کی  
جانب بڑھا۔

پانی کا ٹب بھرا ہوا تھا اور غسل کا سامان لگا ہوا دیکھ کر وہ مسکرایا۔

”واہ مس فوزیہ۔“ وہ بڑبڑایا۔

غسل کے بعد جب وہ کمرے میں آیا تو میز پر ناشتہ رکھا تھا۔ ساتھ ہی  
چائے۔

لڑکی ہے کہ اس کے پاس الدین کا چراغ ہے۔

وہ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا جیسے کوئی طاقت کہہ رہی تھی۔ بیٹھو ناشتہ کرو۔ اور  
وہ حکم مان رہا تھا۔

میر صاحب بھی دروازہ کھول کر آگئے۔

”صبح بخیر۔“

”صبح بخیر میر صاحب۔ آئیے ناشتہ کیجئے۔“

”کسے آپ رات کو اچھی طرح سوئے۔“ میر صاحب نے پوچھا۔

”میر صاحب میں تو سمجھ رہا ہوں کہ میں کسی جادو نگری میں آ گیا ہوں۔“

میر صاحب ہنسنے لگے۔

”آپ کی صاحبزادی پڑھتی ہیں کہیں؟“ ناصر نے پوچھا۔

”ہی۔ اے کر لیا ہے۔ اسی سال۔“

”اچھا۔“ ناصر کو اشتیاق ہوا۔

”جی ہاں، اب تو یہی چاہتا ہوں کہ کہیں کوئی اچھا لڑکا مل جائے تو دو بول

پڑھا کر یہ فرض ادا کر دوں۔“ ناصر انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

نسرن کا غزالہ کے ساتھ بہت میل بول تھا اور آج کل تو حامد سامنے کی طرح اس کے ساتھ رہتا۔ حامد غزالہ کا بھائی بنا ہوا تھا اور اس کا کوئی خاص کاروبار نہ تھا بلکہ کاروبار تو یہ ہی تھا کہ مالدار لڑکیوں کو اپنی چکنی چڑی باتوں سے راغب کرتا۔ ان کی دولت اڑاتا۔ آج کل وہ نسرن کے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن اس شرافت سے کہ بعض اوقات نسرن بخیدگی سے اس کے متعلق سوچنے لگی۔

آج رات کلب میں کلب کی سالگرہ منائی جا رہی تھی اور اس قریب کا انتظار لوگوں کو ایک سال سے تھا کیونکہ ملک کے بڑے ایتھے آرٹس بھی شرکت کرتے اور ورائٹی شو کے علاوہ تین دن تک ایتھے ایتھے پر وگرام ہوا کرتے۔ نسرن اور غزالہ نے بھی اس دن کے لئے شاندار لباس تیار کروائے تھے۔ اور غزالہ کے ساتھ نارنجی ایسکے سیٹ میں ملبوس جس پر سنہری کام آنکھوں کا چکا چوند کر دیتا تھا۔ کلب آئی۔

حامد بھی سیاہ سوٹ میں ملبوس ان کا انتظار کر رہا تھا۔

نسرن کو دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ تو گویا بازی آج آپ کے ہاتھ رہے گی۔ "نسرن اپنی تعریف سن کر اور پھول گئی۔ کئی نظریں نسرن پر اٹھ رہی تھیں۔ وہ ہیلو کہتی ہوئی اپنے لمبے والوں سے باتیں کرنے لگی۔ اور حامد، وہ غزالہ کو نے کی ایک میز پر بیٹھ کر آس کریم کھانے لگے۔

غزالہ آج کل ایک مالدار سیٹھ کے پیچھے لگی تھی۔ سیٹھ کو دیکھتے ہی وہ معذرت کرتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ اور حامد نسرن کی تعریف کرنے لگا۔

"دیکھئے مسز ناصر۔ وہ کو نے پر مصری رقاصہ بیٹھی ہے اس کا رقص بھی ہوگا۔" وہ دور اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔" نسرن نے اشتیاق سے پوچھا۔ رات گئے تک وہ نسرن سے اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔

نسرن اور وہ آکر سٹرا بیچے ہی اٹھے اور دوسرے جوڑوں کی طرح رقص

لے آئیں۔ چائے پیتے ہوئے قمر کا ذکر کرنے لگے۔ چچی جان قمر کی شرارتوں کے قصے سنانے لگیں کیونکہ وہ قمر کی شرارتوں کی بری طرح شکار ہو چکی تھیں۔ ناصر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ گھر میں ایک اور لڑکی تھی جس کی ایک بچی تھی۔ چچا جان کی بڑی بیٹی تھیں اور بیکے آئی تھیں۔ چچا کے بیٹے صفدر اپنی بیوی کے ہمراہ ڈھاکہ چلے گئے تھے۔ اس غرض سے وہ شادی میں بھی شریک نہ ہو سکے تھے۔

ناصر وہاں سے بھی مایوس لوٹ آیا۔ مجسمہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ گھر آکر پھر طلسم خانے کا احساس ہونے لگا۔ فوزیہ مشین تھی شاید پلک جھپکتے ہی کھانا رکھ دیتی۔ ایک منٹ میں چائے آجاتی اور آج ایک نیا واقعہ ہوا۔ نیبل پر ایک گلاس دودھ بھی رکھ دیا گیا۔ گویا ناصر کو آج دودھ بھی پینا تھا۔ آخر آج ناصر نے دودھ پی لیا۔ وہ قہقہہ کرنے پر مجبور تھا۔

مجسمہ رات ہوتے ہی اس پر حاوی ہو جاتا اور پھر وہ سب کچھ بھول کر خیالوں کے تانے بانے بنتا رہا۔ مجسمہ نے اس پر قبضہ کر رکھا تھا۔

☆☆☆

نسرن کی زندگی پھر معمول پر آگئی تھی۔ بچی ڈھائی ماہ کی ہو گئی تھی۔ اکبر علی نے بچی کا نام نغمہ رکھا۔ نسرن کو نغمہ سے بھی پیار نہ تھا۔ نغمہ ہر وقت اپنی آیا کے پاس رہتی۔ اکثر نسرن اسے پورا پورا دن نہ دیکھ سکتی۔ اکبر علی کام معمول ہو گیا تھا کہ وہ شام کی چائے لان میں پیچھے اور آیا بھی بچی کو لے کر پار ہی بیٹھ جاتی۔ بچی ادھر ادھر ناگئیں ہلاتی رہتی اور اکبر علی ناصر کو یاد کرنے لگتے۔

۱۰۔ اٹھ بیضا۔ غسل خانے میں شب پانی سے بھرا ہوا تھا اور تولیہ صابن قرینے سے رکھا تھا۔

نما کر ناصر کمرے میں آیا تو ناشتہ میز پر پہنچ گیا تھا۔ خلاف معمول ناشتہ پر بہت سی چیزیں تھیں۔ گاجر کا حلوا، بسکٹ نمکین، میٹھے۔

اوبو، ناصر نے زور سے کہا۔ مگر چائے کہاں ہے؟ اچانک ایک خوبصورت اور نازک سے ہاتھ میں کیتلی پکڑی ہوئی تھی اور ہاتھ دروازے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ناصر نے کیتلی تھام لی اور وہ ہاتھ کے بارے میں سوچنے لگا۔ فوزیہ کس قدر حسین لڑکی ہے۔ میں تو محض اسے ایک گھریلو قسم کی لڑکی سمجھتا تھا۔ گرم گرم چائے سے سکندری دور ہوئی تو اخبار لے کر بیٹھ گیا لیکن خیال فوزیہ کی طرف تھا۔

اچانک دستک پھر ہوئی اور وہی ہاتھ پھر نمودار ہوا جس میں ایک طفتری تھی اور ورق لگا ہوا پان اس میں رکھا تھا۔ ناصر طفتری تھاتے ہوئے کہنے لگا۔

”میر صاحب گھر پر ہیں؟“

”جی نہیں۔۔ کہیں گئے ہیں۔“ ایک مدھم سی آواز دروازے کے پیچھے سے ابھری۔ جسے ناصر سن کر چونک گیا۔ یہ آواز اس نے پہلے بھی سنی ہے اور وہ دوبارہ آواز سننے کے لئے دوبارہ سوال کر بیضا۔

”آپ کو میری وجہ سے بڑی زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔“

لیکن دروازے کے پیچھے سے کوئی جواب نہ ملا۔

”میں شکر گزار ہوں۔“ ناصر یونہی بے کئے سوال کر رہا تھا۔ اپنے سوال کے جواب میں پھر اسے مایوسی ہوئی۔

”آپ نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟“ ناصر نے اب دوسرا رخ بدلا۔

”بس یونہی۔ بابا اکیلے تھے۔“

اور ناصر بے اختیار کہہ بیضا۔ ”آپ کی آواز اس سے کتنی ملتی ہے؟“

”کس سے؟“ دہلی دہلی ہنسی کے ساتھ سوال کیا گیا تو ناصر بوکھلا گیا۔

”کچھ بھی نہیں۔ میں یونہی کہ گیا۔“

کرنے لگے۔ نرسن کلب کے کئی ممبروں کی ہاہوں میں جھول چکی تھی، لیکن آج تک اس نے کسی سے بے ہودہ حد تک بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حامد کو بھی وہ اب تک ایک اچھا دوست ہی سمجھ رہی تھی۔

مصری رقاصہ کا ناچ بہت اچھا تھا۔ لوگ ونگ رہ گئے تھے۔ اس کے بعد دوسرے آرٹسٹوں نے بھی اپنے فن کا مظاہر کیا۔

رات تین بجے کے قریب نرسن گھروٹی۔ حامد اس کے ساتھ تھا۔ شراب کے نشے میں بھی وہ یوں لگتا تھا جیسے اس نے پی ہی نہیں اسے اپنے آپ پر بڑا کنٹرول تھا۔

نرسن حامد کو چھوڑ کر کوئی لوٹ آئی۔ آج پکی کو لے کر مل رہی تھی اور اکبر علی بھی برآمدے میں کھڑے پریشان تھے۔

نرسن کو دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔ ”غمانہ کے پیٹ میں درد ہے شاید“ بہت رو رہی ہے۔“

نرسن نے آیا کو دوائی دینے کو کہا اور خود بے پروائی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اکبر علی ماسکا کا یہ نمونہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

اور پھر ناصر کی مظلومیت۔

☆☆☆

اتوار کے دن میر صاحب اپنے ایک دوست کے ہاں چلے جایا کرتے ناصر دیر تک سوتا رہا۔

اور پھر نو بجے دستک ہوئی تو وہ جاگ گیا۔ آنکھیں بخار سے سرخ ہو رہی تھیں۔ رات وہ دیر تک جاگتا رہا اور مجسمہ اس کو پریشان کر رہا تھا۔ آنکھیں ملتا

وہ بات بھی نہ بنا سکا اور اس کے بوکھلانے پر دروازے کے پیچھے کھڑی فوزیہ مسکرا رہی تھی۔

”اچھا تو آپ کو بتانا پڑے گا۔“

”کوئی بات ہی نہیں خواہ بخواد آپ کو شک ہو گیا۔“ ناصر ہنس کر بولا۔

”جی نہیں۔ بات کوئی ضرور ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔“ فوزیہ اسے کریدنے لگی کیونکہ وہ اسی دن ناصر سے ایک خواہش کو جگہ دے بیٹھی تھی لیکن حالات سے مجبور تھی۔ فوزیہ نے اسے رقیہ کے گھر دیکھا تھا اور اتفاق سے وہ اسی گھر میں رہنے لگا تو وہ بہت خوش تھی اور اسی لگاؤ کے باعث وہ ناصر کی خدمت میں لگی رہی لیکن جب ناصر کو معلوم نہ تھا تو وہ اور لطف لیتی رہی۔

”فوزیہ۔ خند نہ کرو۔“ ناصر نے اسے بے تکلفی سے پکارا۔

اور فوزیہ کے دل کی دھڑکن اپنا نام ناصر کے منہ سے سننے سے تیز ہو گئی۔

پھر بھی اس نے شرارت نہ پھوڑی۔

”ہو سکتا ہے میں آپ کی مدد کر سکوں۔“ اور ناصر کو خیال آیا کہ شاید

فوزیہ اس کی کچھ مدد کر سکے تو اتنا وہ پوچھ بیٹھا۔

”کیا آپ بھی میرا صاحب کے ساتھ شیخ اسلام کی بیٹی کی شادی پر گئی تھی۔“

”جی ہاں۔ میں تو چار پانچ دن وہیں رہی جس کی شادی ہو رہی تھی وہ میری

بہن عزیز سہیلی ہیں۔“ فوزیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اچھا تو پھر آپ ضرور اسے جانتی ہوں گی۔“ مگر جلد ہی ناصر کو احساس ہوا

کہ وہ ایک لڑکی کے حق میں اچھا نہیں کر رہا اور دوسرے فوزیہ اسے کوئی اوباش

انسان نہ سمجھ لے۔ وہ چپ سا ہو گیا۔

”آپ چپ کیوں ہو گئے؟ بتایا نہیں آپ نے۔“ فوزیہ نے دھڑکنے والے

سے پوچھا۔ اس کی پیشانی سینے سے تر ہو گئی۔

”فوزیہ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بے اختیار میں رہ گیا ہوں۔ اب میں

آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں کوئی بات

نہ کہتی ہوں۔“ ناصر نے اسے بے تکلفی سے پکارا۔

اور فوزیہ یہ بتلے سن کر ناصر کو عقیدت سے دیکھنے لگی جو دروازے سے

لانی دور منہ دوسری طرف کھڑا تھا۔

”آپ ناراض تو نہیں ہوئیں؟“ ناصر نے آہستہ سے پوچھا۔

”جی نہیں۔ اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گی۔“ ناصر

کو یوں محسوس ہوا جیسے فوزیہ ناراض ہو گئی ہے۔ وہ رنجیدہ ہو گیا۔

فوزیہ اپنے دوسرے کاموں کو دیکھنے چلی گئی اور ناصر سرگرت سگ کر کھڑی

میں آگھڑا ہوا۔ نیچے لوگوں کا ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ دور تک کاروں کی لائینیں

لگی تھیں۔ دوپہر تک وہ کہیں نہ گیا بلکہ ادھر ادھر ٹھٹھا رہا۔ پھر ایک جاسوسی

ناول لے کر لیت گیا۔ دسک کی آواز سے پھر وہ متوجہ ہو گیا۔

”کھانا لے لیجئے۔“ فوزیہ نے کہا۔

ناصر نے رُٹے تھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں کل

کسی لڑکے ملازم کا بندوبست کر لوں گا۔“

”نہیں نہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ میں خود ہی کوئی اعتماد والا ملازم رکھ

لاؤں گی۔“ فوزیہ کو جیسے ناصر کا کام کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی تھی۔

”میرا صاحب کھانا بھی دیں کھاتے ہیں؟“

”جی نہیں۔“

”تو آپ نے اتنی ساری چیزیں تیار کر لیں۔“ وہ بہت سی چیزیں دیکھ کر

بولا۔

”آپ فیروں جیسی باتیں نہ کیا کریں۔“ فوزیہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اور ناصر سوچنے لگا فوزیہ کتنی اچھی، کتنی معصوم، کتنی بھولی بھالی ہے لیکن

اس کے لئے وہ اپنے دل کو جذبات سے خالی پا رہا تھا۔ اس پر تو وہ شادی والی

لڑکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بچھا بچھا سا کھانا کھاتا رہا۔ اس دن پریشان تھا۔ دوپہر میں



نہ نہ آئی۔ اس نے کہیں جانے کے لئے کپڑے پہنے مگر کہیں نہ جاسکا اور پھر  
برآمدے میں آکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں میر صاحب بھی آگئے اور ادھر ادھر کی باتیں  
کرنے لگے۔

”بابا۔ چائے۔“ فوزیہ کی آواز آئی۔

میر صاحب چائے لے آئے اور بولے۔

”بھئی ناصر بابو سے کیا پردہ؟ سامنے کیوں نہیں آتی۔“

جیسے ان کو ناصر پر بڑا اعتماد تھا اور پھر رات گئے تک وہ باتیں کرتے رہے۔

○

دو ماہ بیت گئے۔

ناصر کو فوزیہ سے ایک انس تھا لیکن اس انس کو محبت میں کہا جاسکتا تھا۔

وہ ابھی تک اس لڑکی کو نہیں بھلا سکا تھا۔

اس دوران فوزیہ سے اس کی کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں لیکن ناصر نے  
پھر اس سے کوئی بات نہ کی تھی بلکہ فوزیہ کی ہستی اس کے غم پر کسی حد تک  
مرہم کا کام کر رہی تھی۔ وہ جب اس سے باتیں کرتا تو اس کی تھکاوٹ دور ہو  
جاتی تھی۔

وہ فوزیہ کو اپنا غمگسار سمجھتا تھا۔ فوزیہ بھی اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کا  
دل بسھایا کرتی لیکن اس نے ظاہر نہ کیا اور نہ ہی سامنے آئی۔

قمر کے تین چار خط آچکے تھے۔ ناصر جواب دے دیا کرتا تھا اور پھر ایک  
دن یوں ہوا کہ ناصر کو بخار آگیا۔ معمولی بخار تھا۔ ناصر نے میر صاحب سے بھی  
ذکر نہ کیا۔ میر صاحب خود پرانے مریض تھے۔ ان کو دمہ تھا جو کبھی کبھی زیادہ  
حملہ کرتا۔

ناصر نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن اس کے سر میں درد تھا اور وہ بے چینی  
محسوس کر رہا تھا۔

فوزیہ نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

چائے بنا دوں آپ کو؟ جیسے اسے پردے کے پیچھے سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ

ناصر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔

"اوہو۔ فوزیہ۔ تم کتنی اچھی ہو۔" ناصر چونک کر بولا اور پھر کچھ دیر میں وہ چائے تھما رہی تھی۔

جب ناصر ٹرے پکڑنے لگا تو اسے زور کا پتھر آیا۔ وہ دروازے کو تھام کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ کی طبیعت تو زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔“ فوزیہ گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

”معاف کیجئے“ ذرا رقیہ بھائی کو بلا دیں۔“  
تب اس کے جذبات میں اپیل سی مچ گئی۔

”آپ لیٹ جائیں، میں بابا جان کو بھیجتی ہوں۔“  
ناصر آکر لیٹ گیا۔ میر صاحب نے آکر دیکھا تو بخار تیز تھا۔ ناصر کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ شرت بخار سے تھمرا رہا تھا۔ میر صاحب گھبرا گئے اور فوریہ ایسی بدحواس ہو گئی کہ فوراً میر صاحب کو ڈاکٹر لینے کے لئے بھیج دیا ڈاکٹر نے آکر انجکشن لگایا۔ نسخہ لکھا اور فوریہ لے کر چلا گیا۔

کافی رات تک میرے صاحب بیٹھے رہے۔

ناصر کا بخار نہ جانے کیوں تیز ہو گیا۔ اس پر کچھ بیہوشی طاری ہو گئی۔ فوزیہ اتنا گھبرا گئی کہ پردہ وغیرہ بھول کر ناصر کے پاس چلی آئی۔

لیکن ناصر کو اس وقت اپنا ہوش نہ تھا۔ وہ فوزیہ کو کیا دیکھ سکتا تھا۔ فوزیہ نے تھرماسٹر لگا کر نمپیرچ لیا۔ بخار ۱۰۵ ڈگری تھا۔ اس نے گھبرا کر باپ کو دیکھا جو سنے کی وجہ سے ریشان تھا۔

”آپ جا کر آرام کریں بابا۔ میں یہیں بیٹھتی ہوں۔“

”نہیں بیٹی تم میرا بستر نہیں لا دو۔ میں یہیں سو جاتا ہوں۔“

اور فوزیہ نے بھی یہی مناسب سمجھا۔ وہ فوراً باپ کا ہسز اور چارپائی لے آئی۔ میر صاحب لٹ گئے اور فوزیہ ناصر کے سرہانے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے چہرے کو تک رہی تھی اور دل میں وعامیں مانگ رہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ناصر اس کو نہیں چاہتا، بلکہ اس کے خیال کو دل میں بسائے ہوئے ہے اور کسی

بابا' یہ چائے۔ پھر وہی ہاتھ آگئے۔

اچھا، کوشش کریں گی آپ۔  
ضرور۔

آپ اسے جانتی ہوں گی۔ ناصر کا عزم پھر چکنا چور ہو گیا اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کہہ بیٹھا۔  
کئے۔  
ہے ایک۔

مجھے نہ بتائیے گا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی آپ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ کہہ دیجئے نا۔ میں کسی سے نہ کہوں گی۔  
ناصر ہچکا رہا تھا۔

کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟  
نہیں نہیں، یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ جیسے شیخ اسلام...  
کون سے شیخ اسلام؟ فوزیہ کو ناصر کو چھوڑنے میں مزہ آرہا تھا۔  
وہ جس کی بیٹی آپ کی سہیلی ہیں۔

اچھا، اچھا... وہ شیخ اسلام... پھر...  
ان کے ہاں آپ شادی پر مسمیٰ تھیں نا۔

میں تو چار پانچ دن وہاں رہی تھی، کیوں؟  
وہاں ایک لڑکی آئی تھی جس کو میں نے اتفاقاً دیکھ لیا تھا۔

تو پھر کیا ہو گیا۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ فوزیہ ہنسی چھپائے ہوئے کہنے لگی۔  
ناصر لا جواب ہو گیا۔ بھلا وہ کیسے فوزیہ کو سمجھاے۔

بتائیے نا۔ وہ اسے چپ ہوتا دیکھ کر کہنے لگی۔

وہ لڑکی۔ میرا مطلب ہے اس لڑکی کو جانتی ہیں۔ اور ناصر کو خود بھی اس سوال پر ہنسی آگئی۔

کچھ اتنا پتہ بتائیے۔ کچھ نشانی بتائیے۔ فوزیہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔  
نشانی؟

اس نے سنہری کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ بے حد خوبصورت تھی اور

میں آپ کا کس طرح شکر یہ ادا کروں۔ ناصر کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔  
چائے کے بعد وہ لال دوائی پی لیں۔ فوزیہ نے کہا۔

پلی لوں گا۔ ناصر نے آہستہ سے کہا۔

فوزیہ کا دل چاہا کہ وہ ناصر کے سامنے جا کر اس کی پریشانی دور کرے لیکن یہ خیال صرف دل میں ہی رہا۔ وہ اپنے آپ میں اتنی جرات پیدا نہ کر سکی۔  
فوزیہ بیٹی، اندر آکر دوائی بابو کو دے دو۔ میر صاحب نے کہا۔ فوزیہ دروازے کے پیچھے کھڑی لرز گئی۔

رہے دیجئے میر صاحب۔ میں پلی لیتا ہوں۔ ناصر شاید فوزیہ کو سمجھ گیا تھا۔  
میر صاحب کچھ دیر بعد دفتر چلے گئے اور ناصر پبلک پر لینا لینا سگریٹ پینے لگا۔

آپ اتنے سگریٹ کیوں پیتے ہیں۔ دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔  
اوپو، آپ موجود ہیں۔ ناصر کو احساس ہوا کہ وہ زیادہ وقت یہاں ہی کھڑی

رہتی ہے۔

آپ نے جواب نہیں دیا۔

جی، بس یونہی، اور کیا کروں؟ وہ بے بسی سے بولا۔

ایک بات کہوں؟ فوزیہ نے مجھتے ہوئے کہا۔  
کہئے۔

آپ شادی کر لیجئے اب۔ یہ سونا سونا گھر آباد ہو جائے گا۔ فوزیہ رکتے رکتے کہنے لگی۔

شادی۔ ناصر مسکرایا۔

کیوں؟

شادی میں نہیں کروں گا۔

آخر کیوں؟

پسند کی لڑکی نہیں ملتی۔ ناصر مذاقاً کہہ گیا۔

میں آپ کی پسند کیا جانوں، ورنہ کوشش کر دیتی۔

آپ کے قریب ہی رہتی ہے۔

میرے قریب۔

جی ہاں، اسی محلے میں رہتی ہے۔ فوزیہ نے بات بنائی۔

اچھا۔

ناصر کا اشتیاق دیکھ کر فوزیہ نے کہا۔

میں آپ کے لیے کیا کچھ پاؤں۔

رہنے دو پہلے مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔ ناصر بہت ہی بے چین تھا۔

پھر کسی وقت سہی۔

تم مجھے ستارہ ہی ہو۔ ناصر اس سے بے تکلف ہو گیا۔

میری ماننے تو اس کا خیال چموز دیتے۔ فوزیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

کیوں کیا اس کی شادی ہو گئی ہے۔

نہیں شادی تو نہیں ہوئی لیکن وہ مجھے کچھ اچھی نہیں لگتی۔

ناصر کو فوراً "احساس ہوا کہ کہیں فوزیہ مجھ سے محبت تو نہیں کرتی۔ اور وہ

چپ سا ہو گیا۔

آپ چپ کیوں ہو گئے؟

کیا کون پھر؟ ناصر بے بسی سے بولا۔

بابا سے بات نہ کیجئے ...

نہیں، ناصر مجھ سا کیا۔

دوپہر کو وہ ناصر کے لیے بھنی لائی تو ناصر برا اداس تھا۔

فوزیہ اپنے کاموں میں لگ گئی۔ وہ بہت خوش تھی اور ناصر کی بے بسی کا

لفظ اٹھانے کے علاوہ اسے ناصر پر ترس بھی آنے لگا تھا۔

آپ فکر نہ کیجئے، میں آپ کی مدد کروں گی۔ تب ناصر کے دل کی کلی ایک

دم کھل گئی اور وہ بھنی پیتے ہوئے بولا۔

بہت اچھی ہو فوزیہ۔

جی ہاں، آپ بنائے نہیں۔ وہ ہنس کر کہنے لگی۔

اس کی مجھے کوئی نشانی یاد نہیں۔ ناصر کو خود بھی پسند آ گیا۔

سنری کپڑے۔ وہ یاد کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ایک تو خالہ زہرہ اور ایک

تھیں نوشاہہ باجی۔ فوزیہ شرارت بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

نوشاہہ، شاید انہوں نے بھی سنری۔ ناصر چونک کر بولا۔

ہاں، لیکن وہ تو چھ بچوں کی ماں ہیں۔ خوبصورت بڑی ہیں۔ فیشن میں بھی

وہ ٹانگ ہیں۔

ناصر سمجھ گیا کہ فوزیہ اُسے ستارہ ہی ہے۔ ہنس کر کہنے لگا۔

کسی اور کے نام بھی گنوا دیجئے۔

فوزیہ ہنسنے ہوئے کہنے لگی۔

ایک اور تھیں انہوں نے بھی سنری غرارہ پن رکھا تھا۔ نام تو ان کا بی

حیدر تھا لیکن فیشن اور زمانے سے انہوں نے اپنا نام شاہدہ رکھا تھا۔ بڑے

مزے کی باتیں کرتی ہیں۔ زندہ دل بہت ہیں۔ ہر وقت غرارہ پننے رہتی ہیں۔

فوزیہ، سنجیدگی سے بتاؤ۔ ناصر ان باتوں سے اکتا سا گیا۔

آپ جس کو پوچھتے ہیں میں جانتی ہوں۔ بڑی بددماغ سی لڑکی ہے۔ فوزیہ

دھڑکتے ہوئے دل سے کہنے لگی۔

نہیں نہیں، وہ بددماغ نہیں ہے، تم کسی اور کا کہہ رہی ہو۔

جی نہیں، اسی کا کہہ رہی ہوں۔ کوئی نشانی بتاؤں۔

بتاؤ۔

نشانی یہ کہ وہ اوپر سونے کے لیے گئی تو اندھیرے میں آپ کے پلنگ کے

ساتھ ٹھوکر کھا گئی۔ آپ نے جی جلائی۔

فوزیہ کہتی جا رہی تھی اور ناصر کا دل مسرت اور حیرت میں دھڑک رہا تھا۔

اور پھر آپ نے اس سے کہا تھا کہ آپ یہاں سو جائیے لیکن اس نے کہا،

نہیں آپ سو جائیے۔

بالکل ٹھیک، ہاں وی، کہاں رہتی ہے وہ۔ وہ کس کی بیٹی ہے۔ ناصر نے

بے قراری سے پوچھا۔

تو کب ملاؤ گی۔

اب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کو بھول گئی ہو۔

ہاں، شاید۔ ناصر کھویا کھویا سا بولا۔

ایسا نہ ہو کہ مجھے جوتے کھانے پڑیں۔ فوزیہ نے ہنس کر کہا۔

اور ناصر واقعی اداس ہو گیا۔

میر صاحب جلدی دفتر سے آ گئے۔ کیونکہ ان کی بھی طبیعت خراب تھی۔

ناصر کو فوزیہ زبردستی دوائیں پلاتی رہی حالانکہ اس نے کہا بھی کہ اب میں

اچھا ہوں لیکن فوزیہ نہ مانی۔

شام کو وہ باہر برآمدے میں بیٹھ گیا اور سوچتا رہا۔

کبھی تو وہ مسکرا دیتا اور کبھی آہیں بھرنے لگتا اور باورچی خانے کے ساتھ

والے دروازے سے فوزیہ اس کا معائنہ کر کر کے مسکرا رہی تھی۔ اور ناصر سوچ

رہا تھا کہ کیا واقعی میری زندگی میں بہار آ سکتی ہے کبھی ... لیکن اسے یقین نہ

تھا۔ اپنی حراماں مٹھیں پر ...

○



ناصر اب پوری طرح صحت مند تھا اور دفتر جانے لگا تھا۔ قمر کے واپس آنے کے دن آ گئے تھے۔

اور فوزیہ تو اب ناصر کی رازدار بن گئی تھی اور اکثر اس لڑکی کے متعلق

اسے یقین دلاتی۔ ناصر فوزیہ کو اپنا ہمدرد سمجھتا تھا۔ اسے ایک شکایت تھی اور

ایک دن اس نے فوزیہ سے خوب بحث کی تھی۔

ہوایوں کہ ناصر موڈ میں تھا اس دن۔ ہنس کر کہنے لگا۔

”فوزیہ کلویٹرہ پکچر لگی ہے چلو تمہیں دکھلاؤں۔“

”مجھے۔ پکچر۔“ فوزیہ حیرت سے بولی۔

”ہاں کیوں؟ حیرت کی کیا بات ہے؟“

”میں کیسے جاسکتی ہوں؟“ وہ ہنکپاتے ہوئے بولی۔

”اچھا پھر آج ایک بات کا فیصلہ کرو۔“ ناصر تنک آ کر بولا۔

”کس بات کا؟“

”میں کہ تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟“

”میں آپ کو۔“ فوزیہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”ہاں بتاؤ۔“

فوزیہ سٹنا گئی۔

اور ناصر نے پھر وار کیا۔

”کیا تم کو مجھ پر اعتماد نہیں۔ کیا میں تمہاری نظر میں کوئی برا انسان ہوں۔“

"اچھا تو پھر میں چلا۔ کل تمہارا تحفہ لے کر آؤں گا۔"  
ناصر چلا گیا۔ اور فوزیہ کام میں لگ گئی۔ آج اسے ناصر کا کمرہ صاف کرنا تھا۔ اس نے سامان باہر نکالا اور کمرے کو بھانڈے لگی۔ کمرے کو بھانڈ کر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور ننگے کے خلاف بدل کر سوئی دھاگے سے ٹانگے لگانے لگی۔

وہ ناصر کے بنگ کے پتکے پر تکیہ کو ٹانگے لگا رہی تھی۔  
اسے معلوم تھا کہ بیٹہ ناصر کس ٹائم گھر آتا ہے اور جب وہ آتا ہے تو کھٹکا کر کے آتا ہے اس لیے وہ اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔  
اور اسی دن ناصر کو شرارت سوچھی۔ وہ دفتر جانے کی بجائے بازار گیا۔ ایک خوب صورت لاکٹ خریدا اور واپس گھر لوٹ آیا۔ ناصر نے آج تہیہ کیا تھا کہ فوزیہ کا پردہ تڑوا دے گا۔ وہ دبے پاؤں بیڑھیاں طے کرنے لگا۔

اور پھر چپکے سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔  
فوزیہ دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔  
ناصر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔  
وہ مزے سے ٹھٹکا رہی تھی۔  
کچھ ہوتے تو آواز آتے رے۔

رسیا او غلاما۔ تجھے دل دک داغ دکھاتے رے۔  
اچانک ناصر کے منہ سے نکلا: واہ واہ بہت اچھا لگاتی ہو۔  
فوزیہ گھبرا کر مڑی۔ "آپ۔"

اور پھر اسے دیکھ کر ناصر پر ایک بجلی سی گری۔  
"آپ۔ فوزیہ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تم فوزیہ؟"

لیکن فوزیہ دروازہ کھول کر بھاگ چکی تھی۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا۔ ناصر پر سکتے کا عالم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فوزیہ جو اس کی رازدار ہے۔ اس کی ٹھکانا ہے۔ وہ مدد پارا ہوگی۔ اس کے خوابوں کی ملکہ ہوگی۔  
وہ کرسی پر بیٹھ کر سب باتیں سوچنے لگا۔ اور ایک دم ایک شریر سی

"مگر یہ تمہید کس لیے ہے۔" فوزیہ واقعی گھبرا گئی تھی۔  
"میں بہت تنگ آ گیا ہوں۔ آخر یہ کہاں کی تک ہے۔"  
"بتائیے بھی کچھ۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" فوزیہ نے کہا۔  
"یہ کہ تم مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہو۔" آخر ناصر نے کہہ ہی دیا۔  
"اوہو۔ یہ بات ہے؟" فوزیہ ہنس دی۔  
"تم ہنس رہی ہو اور مجھے غصہ آ رہا ہے۔" ناصر واقعی جھلا گیا تھا۔  
"میں آپ سے پردہ توڑ دوں؟"

"ہاں تو اور کیا؟"  
"اچھا ایسا ہی کروں گی۔"  
"تو پھر آؤ سامنے میر صاحب بھی کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں۔"  
"آج تھوڑی۔"  
"پھر کب؟"

"جب آپ کی شادی ہوگی۔"  
"میری شادی تو عمر بھر نہیں ہوگی۔"  
"تو بس پھر۔ کسی اور دن توڑوں گی۔"  
"کب؟"

"تحفہ لائے کوئی میرے لیے تب۔"  
"اچھا تحفہ بھی لے آؤں گا۔" ناصر ہنس دیا۔ اس کے دل میں فوزیہ کی قدر تھی۔ فوزیہ سے انس تھا۔ وہ اس کی ٹھکانا تھی۔ ہمدرد تھی۔ رازدار تھی۔ لیکن فوزیہ کو وہ کسی اور نظر سے نہ دیکھتا تھا۔  
دل پر تو کسی اور ہی کا راج تھا۔ لہذا اس نے وعدہ کر لیا کہ تحفہ لے آئے گا اور پھر فوزیہ سامنے آئے گی۔

ادھر فوزیہ بری طرح گھبرا رہی تھی۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ناصر کو اس کا پردہ کھٹکا تھا اور پھر اسے معلوم تھا کہ پردہ چھوٹ گیا تو سارا پردہ نیں ختم ہو جائے۔ راز کھل جائے گا اور پھر نہ جانے کیا ہو؟

مکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔ شریر کہیں کی کتنا ستایا مجھے؟ تب وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

اور دروازے کے پیچھے کھڑی فوزیہ ہینسہ ہینسہ ہو رہی تھی۔

نامرے وہ چڑچڑ باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اب اس کا حلق خشک تھا۔ زبان میں چبے کانٹے پڑ گئے تھے۔ چہرہ شرم سے لال بھوکا ہو گیا تھا۔ کافی دیر کے بعد نامرے آواز دی۔ ”فوزیہ“

لیکن فوزیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

”پتہ ہے ایک بچ گیا۔ کیا آج کھانا بھی نہیں لے گا ہمیں۔“ وہ بے وجہ ہنس رہا تھا۔ فوزیہ کھانا کماں سے دیتی۔ آج کچھ پکا ہی نہیں تھا۔ پہلے وہ کام کرتی رہی تھی اور پھر گیارہ بجے سے یہاں خاموش کھڑی تھی۔

اسے احساس ہوا کہ اب کیا کرے۔ میر صاحب بھی آنے والے ہوں گے۔

وہ دوڑی دوڑی کچھ پکانے کی تیاری کرنے لگی کہ میر صاحب آ گئے۔

”لاؤ بیٹی جلدی سے کھانا لاؤ بھوک بہت زیادہ لگی ہے۔“

”بابا آج میں کھانا نہیں پکا سکی۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔

”ہیں۔ کھانا نہیں پکایا۔ تو کیا نامر میاں بھی اب تک بھوکے ہیں۔“

”ہاں بابا۔“ وہ آہستہ سے کہنے لگی۔

”اچھا تو پھر دو مجھے ڈونگا۔ باکر بازار سے کچھ لے آؤں۔“

میر صاحب بازار سے وہی اور سالن وغیرہ لے آئے۔ فوزیہ نے جلدی سے

نرے میں کھانا لگا کر بابا کے ہاتھ نامر کو بھیج دیا۔

میر صاحب نے نامر کو دیکھتے ہی کہا۔

”آج کھانا ہی تیار نہ کیا لگی ہے۔ اب بازار سے لایا ہوں۔“

اور نامر مسکراتا ہوا کھانا کھانے لگا۔

اسے مسکراتا دیکھ کر فوزیہ بھی دروازے کے پیچھے مسکرا رہی تھی۔ کھانے

کے بعد میر صاحب سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نامر کو نیند نہ آئی تھی۔

فوزیہ دروازے کے پیچھے کھڑی تھی۔

”آپ۔ موجود ہیں۔“ نامر کو احساس ہوا کہ دروازے کے پیچھے کوئی ضرور

ہے۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ دروازہ کھولنے لگا لیکن اسی لمحے دروازہ سختی سے بند کر لیا گیا۔

اور وہ ہنستا ہوا واپس اپنے بستر پر آ بیٹھا۔

شام کی چائے بھی میر صاحب لائے۔ چائے پیتے ہوئے میر صاحب نے بتایا کہ۔

”رات اس کی مرزا کے ہاں دعوت ہے۔“

”اچھا۔“ نامر نے کہا۔

”ہاں، ذرا دیر سے آؤں گا۔“

”کیا کوئی خاص بات ہے؟“ نامر نے پوچھا۔

”تم سے کیا پردہ ہے میاں نامر مجھے تو فوزیہ کا غم کھائے جا رہا ہے تمہیں

معلوم ہے کہ میں چراغ محری ہوں۔ میرا کچھ پتہ نہیں۔ مرض ایسا ہے کہ ختم

نہیں ہوتا۔ اور نہ کوئی امید ہے۔ مرزا صاحب نے ایک لڑکا بتایا تھا۔ بڑھا کھا

اور شریف ہے وہ بھی آج آ رہا ہے دعوت میں۔“

اور نامر بری طرح گھبرا رہا تھا۔ چہرہ ہینسہ سے تر تھا۔

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”آپ کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں فوزیہ کی آپ بالکل

گنہ گار کریں۔“

”خدا تمہیں سلامت رکھے بیٹا لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ کام میری زندگی

ہی میں ہو جائے۔ اور اس وقت اتفاق سے رشتہ اچھا مل رہا ہے۔“ میر صاحب

نے کھانسنے ہوئے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن۔“ نامر کو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا

ہے اور کیسے میر صاحب سے کہا ہے۔

”لیکن کیا بیٹا۔“ میر صاحب نے پوچھا۔

”پاؤں جل گئیں۔ ٹھہریے میں نئی سیاہی لاتی ہوں۔“ وہ گھبرائی ہوئی میز کی طرف بڑھی اور سیاہی لاکر ناصر کے پاؤں پر انڈیلنے لگی۔ ناصر تکلیف کے باوجود مسکرا رہا تھا اور فوزیہ کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اس نے جان بوجھ کر کہا۔ ”اف۔“  
”کیوں؟ بطن محسوس ہو رہی ہے کیا؟“ فوزیہ سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

”ہاں۔“ وہ مسکراہٹ ضبط کر کے کہنے لگا۔  
”ادہو۔ میں بہت بری ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو تکلیف سہنا پڑی۔“  
اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپنے لگے۔

اور ناصر گھبرا گیا۔ ”ارے تم رونے لگیں۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ حالانکہ سیاہی سے ٹھنڈک پڑ چکی ہے۔“ وہ بچ بچ رو دی۔

اور ناصر نے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔ ”بھئی۔“ وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں آج بہت خوش ہوں فوزیہ شاید زندگی میں کوئی گھڑی ایسی نہیں آئی جیسی کہ آج۔“ وہ فوزیہ کے آنسو پونچھ رہا تھا جو اس کے لیے اتنی پریشان ہو گئی تھی۔

”میں تو بھول گئی۔ گھر میں تو جلنے والے زخم کی دوا پڑی ہے۔ میں ابھی لاتی ہوں۔“ ناصر اس کی بوکھلاہٹ پر ہنس دیا۔

”تم پریشان نہ ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور پھر یہ زخم مجھے بہت عزیز ہے۔“

اور فوزیہ نے شرابا کر منہ پھیر لیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ دوا لے آئی اور زخم پر اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے مرہم لگانے لگی۔

ناصر اسے پیار سے سمکتا رہا۔ عورت ---- واقعی ایک پہیلی ہے کبھی اسے دیکھ کر ناگن کا احساس ہوتا ہے اور کبھی یوں لگتا ہے جیسے فرشتہ۔

”اب کچھ ٹھنڈک پڑی۔“ فوزیہ مصیبت سے پوچھنے لگی۔  
”نہیں کچھ زیادہ ہی جلن ہونے لگی۔“

”میر صاحب میں آپ کو کل بتاؤں گا۔“ ناصر دل کا مدعا زبان پر نہ لاسکا۔  
”مگر میں نے آج مرزا صاحب کو کچھ جواب دینا ہے۔“ میر صاحب ناصر کی بات سمجھ رہے تھے۔

”میر صاحب فوزیہ۔“ وہ چپ ہو گیا۔  
”ہاں ہاں بیٹا۔ کیا بات ہے؟“ میر صاحب دل میں خوشی سی محسوس کر رہے تھے۔

”مجھے اپنا بیٹا بنا لیجئے۔“ ناصر نے بڑی مشکل سے کہا۔  
”میرا بیٹا“ میر صاحب نے جوش میں آکر ناصر کو سینے سے لگا لیا۔  
”اچھا۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہوگی“

اور ناصر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا جہاں کی خوشیاں سٹ کر اس کی جھولی میں آگری ہیں۔

میر صاحب کو اب تک یہی معلوم تھا کہ ناصر کا سوائے قرعے دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”اچھا تو میں دعوت میں جا رہا ہوں بیٹا“  
اور ناصر نے مسرت سے سرشار انہیں رخصت کیا۔

اور پھر دروازے پر دستک دی۔  
”ذرا چائے کی گرم کیتلی دیجئے۔“ حالانکہ وہ چائے پی چکا تھا اور پھر وہ انتظار میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں چائے کی کیتلی انہی خوب صورت اور کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تھی اور دروازے سے باہر ہاتھ نکلے۔

ناصر آہستہ سے آگے بڑھا اور اس نے فوزیہ کا ہاتھ تھام لیا۔  
گرم گرم کیتلی سے فوزیہ کا ہاتھ جل رہا تھا اور گر کے ٹوٹ گئی اور ناصر کے پاؤں پر پڑی۔

ناصر نے سلیپر پہن رکھے تھے۔ گرم چائے سے پاؤں میں آبلے پڑ گئے اور شدید تکلیف سے وہیں بیٹھ گیا۔ فوزیہ دروازہ سے باہر آئی۔



”ہیں۔“ وہ حیرت سے بولی۔  
 ”ہاں۔“ وہ ہنس دیا اور وہ شرما گئی۔  
 ”آپ آرام کیجئے۔“ وہ شرما رہے ہوئے بولی۔  
 وہ دونوں ہنسنے لگے۔ کیونکہ وہ ابھی تک دروازے کے پاس ہی بیٹھے تھے۔  
 فوزیہ ناصر کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور ٹوٹی ہوئی کیتلی کے ٹکڑے جمع کرنے لگی۔  
 وہ ٹکڑے باہر پھینکتے مٹی تو ناصر اٹھ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔  
 فوزیہ اپنے ٹلیٹ کی طرف جانے لگی تو ناصر نے آواز دی۔  
 ”فوزیہ“ وہ پلٹ آئی۔  
 ”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔  
 وہ سمجھتی ہوئی بیٹھ گئی۔  
 ”تم نے مجھے اتنا کیوں ستایا؟“ وہ مسکرا کر بولا۔  
 فوزیہ چپ چاپ زمین کو گھورتی رہی۔  
 ”جواب دو نا۔“

”بھول جائیے اب پرانی باتوں کو۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولی۔  
 ”ابھی صاحب بھول گئے۔ پتہ ہے آج میر صاحب کہاں گئے ہوئے ہیں؟“  
 ”مرزا صاحب کے ہاں۔“ فوزیہ نے جواب دیا۔  
 ”یہ پتہ ہے کہ کس لیے گئے ہیں؟“  
 ”نہیں تو۔“  
 ”آپ کا رشتہ طے کرنے۔“  
 ”جھوٹ۔“ وہ گھبرا گئی۔  
 ”بالکل سچ۔“ ناصر سنجیدگی سے کہنے لگا۔  
 ”اب آپ بدل لے رہے ہیں۔“  
 ”نہیں، مجھے قسم ہے تمہاری۔ آج انہوں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔  
 بات کچی ہو گئی ہے۔“ وہ چہرے پر اداسی لاتے ہوئے بولا۔

”آپ مجھے ستا رہے ہیں۔“ وہ اور بھی اداس ہو گئی۔  
 ”بس فوزیہ خدا کو یہی منظور تھا۔ کاش، تم پہلے میرے سامنے آ گئی  
 ہوتیں۔ میں غلط فہمی میں نہ رہتا۔“ وہ اداسی سے کہہ رہا تھا۔  
 اور فوزیہ کی آنکھیں آب گوں ہو گئی تھیں۔  
 ”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ وہ رو ہانسی ہو کر کہنے لگی۔  
 ”سچ۔“ میں تمہیں دیکھ کر سب کچھ بھول ہی گیا تھا۔“  
 اور فوزیہ آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔  
 ”آپ نے ان سے کچھ نہ کہا؟“  
 ”میں نے بہت کہا۔ لیکن وہ مانے نہیں۔“  
 فوزیہ کی آنکھیں سو گوار ہو گئیں۔ اور اس اداسی میں وہ ناصر کو ایک ہمسرہ  
 لگ رہی تھی۔ وہ اسے ستاتے ہوئے بولا۔  
 ”غضب تو یہ ہے کہ ان کا شادی کرنے کا ارادہ بھی بہت جلدی ہے۔ میرا  
 خیال ہے اسی پہنچے ہے۔“ فوزیہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی اور زیادہ دیر وہاں نہ  
 ٹھہر سکی۔ آنکھوں پر دوپٹہ رکھے اٹھ گئی۔  
 ناصر بہت دیر تک مسکراتا رہا۔ کچھ دیر بعد میر صاحب آ گئے۔  
 ”میں نے مرزا صاحب کو جواب دے دیا۔ وہ بڑے سٹھانے لیکن جب میں  
 نے تمہارا نام لیا تو چپ ہو گئے۔“  
 ناصر آہستہ سے بولا۔ ”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں میر صاحب آپ نے  
 مجھے اس لائق سمجھا۔“  
 ”شکر گزار تو میں ہوں بیٹا“  
 ”شرمندہ نہ کیجئے۔“ میر صاحب بے وجہ قہقہے لگا رہے تھے۔  
 اور فوزیہ اندر سمجھ رہی تھی کہ آج اس کے والد کے قہقہے اس کے مقدر  
 کے لیے ہیں۔ وہ آنسو بہاتی رہی اور چاند کو دیکھتی رہی۔

”بہی جواب دو۔“

”بابا آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں۔ آپ کو اختیار ہے۔“

اس نے آہستہ سے جواب دیا اور میر صاحب کو تسلی ہو گئی۔

ناصر کو چائے دینے گئے تو وہ سو رہا تھا۔ وہ تو فوزیہ کی دستک پر جاگا کرتا تھا۔ میر صاحب کے آواز دینے پر اٹھا۔ جلدی جلدی غسل کیا اور پھر ناشتہ کرنے لگا۔

میر صاحب اور وہ دونوں اکٹھے دفتر گئے۔ اور پھر دفتر میں ناصر کو تار ملا کر صبح قرارداد رقیہ پہنچ رہے ہیں۔ وہ بڑا خوش ہوا۔  
دفتر کے بعد وہ فیکٹریوں میں انکسپکٹ کے لیے چلا گیا۔

اور شام کو لوٹا۔

چائے کی بڑی طلب محسوس ہوئی میر صاحب شاید گھر پر نہیں تھے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

”مجھے چائے کی ضرورت ہے“ وہ زور سے بولا۔

”آپ کو کچھ نہیں مل سکتا۔“ دور سے فوزیہ کی آواز آئی۔

”میرا قصور؟“

”آپ جھوٹ بت بولتے ہیں“

”کیا گتہ فی ہو گئی مجھ سے؟“

”کل کی بات یاد کیجئے۔“

”میں نے بالکل جھوٹ نہیں بولا۔“

”جی ہاں۔ مرزا صاحب۔ یہ سب کچھ سچ تھا۔“

”بالکل سچ تھا۔ کل سے آپ پرانی تو ہو گئی ہیں۔“

”باتیں بنانے میں بہت تیز ہیں۔“

”آپ سے کم۔ اتنے عرصہ میں طرح طرح کی باتیں بیانیہ کر پریشان کون کرتا

رہا؟“

”آپ نے بدلا بھی تو لے لیا۔“



”تمہاری آنکھیں کیوں سوچی ہوئی ہیں بیٹی“ میر صاحب فوزیہ کو دیکھ کر بولے۔

”کچھ نہیں بابا۔“

”کچھ تو ہے۔ چہرہ بھی بڑا اداس لگ رہا ہے۔“

”نہیں بابا کوئی بات نہیں۔“

”بیٹی میں نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے۔“

”بابا آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔“

”اچھا یونی سہی۔ ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم اسے سوچ کر جواب دے

دو۔“

”کیا بابا؟“ فوزیہ سمجھ گئی کہ بابا ضرور اس کا رشتہ طے کر آئے اور اب

پوچھنا چاہتے ہیں۔

”میرے خیال میں ناصر کو تم بھی پسند کرو گی۔ وہ بڑا لائق لڑکا ہے۔ میں

نے ابھی اسے تمہاری طرف سے تسلی نہیں دی۔ تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو گی

بیٹی۔ میں تو چراغ سحری ہوں۔ مگر تم مجھے سخی نظر آؤ تو جین رہے گا۔“

اور فوزیہ کے دل کی کلی اپنے بابا کی بات سے کھل گئی۔ ساتھ ساتھ اسے

ناصر پر غصہ آ رہا تھا اس نے کتنا جھوٹ بولا۔ میں ساری رات روتی رہی۔

خالم۔ اب میں بالکل نہیں بولوں گی۔ کیوں۔ پھر وہ آپ ہی آپ مسکرائے گئی۔

اسے مسکراتے دیکھ کر بوڑھے میر صاحب بھی مسکرائے۔

"یوں ہوتی ہے تکلیف۔ ذرا آپ کو احساس دلانے کے لیے۔"  
 "میں آپ سے نہیں بولتی۔"  
 "نہ بولو۔ کون پرواہ کرتا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔  
 "کیا؟"

"جو آپ نے سنا ہے۔"  
 "آپ کو لڑائی کرنی بھی بہت آتی ہے۔"  
 "آپ سے کم؟"  
 "افوہ۔"

"جی ہاں۔ اچھا آپ چائے لے گی یا نہیں۔"  
 "جی، جیتیتی ہوں۔"  
 "اُس کے ہاتھ؟"  
 "کوئی تو لے کر آئے گا ہی۔"

ناصر مسکراتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے سوچا کہ فوزیہ چائے رکھ کر بھاگ جائے گی۔ وہ دروازے کے پیچھے پردہ اپنے اوپر ڈال کر چھپ گیا۔  
 تھوڑی دیر بعد فوزیہ نے دستک دی لیکن وہ کچھ نہ بولا۔  
 دستک کا جواب نہ ملنے پر اس نے سر نکال کر ادھر ادھر جھانکا اور پھر کسی کو نہ دیکھ کر ٹرے لے کر باہر نکل آئی۔ میز پر ٹرے رکھا اور باہر جھانکنے لگی۔  
 ناصر پردے کے پیچھے سے باہر نکل آیا اور حکم دیتے ہوئے بولا۔

"چائے بناؤ۔"  
 "ہائے اللہ۔" فوزیہ گھبرا کر پٹلی اور پھر ماتے پر پل ڈال کر بولی۔  
 "نہیں بناتی۔"

"اچھا۔" ناصر نے اس کی چوٹی پکڑ لی۔  
 "اف۔ چھوڑیے میرے بال۔" وہ چیخی۔  
 "چائے بناؤ۔"

"بناتی ہوں۔ آپ میرے بال تو چھوڑیے۔"  
 ناصر نے ہنس کر بال چھوڑ دیے اور وہ مسکراتی ہوئی چائے بنانے لگی۔  
 "چائے ہو کل رقیہ اور قمر آ رہے ہیں۔"  
 "سچ۔" وہ خوش ہو گئی۔  
 "ہاں۔ کیونکہ میری شادی ہو رہی ہے۔"  
 "اچھا۔ کب؟" فوزیہ حیرت سے بولی۔  
 "ہاں، ایک نہایت لڑاکا لڑکی ہے۔"  
 "تو پھر کیوں کر رہے ہیں اس سے شادی۔"  
 "آہستہ بولو۔ سن لیا تو تمہیں کچا ہی کھا جائے گی اور میرا حال علیحدہ ہوگا۔"  
 وہ منہ پر انگلی رکھ کر بولا۔  
 "کیا وہ یہیں رہتی ہے؟"  
 "ہاں وہ ہر وقت میرے پاس ہوتی ہے۔"  
 "آپ اس سے شادی کرنا نہیں چاہتے؟"  
 "دراصل اب تم سے کیا پردہ۔ وہ مجھ سے خود شادی کرنا چاہتی ہے۔"  
 "جھوٹ۔" فوزیہ کو بچ کوچ غصہ آ گیا۔  
 "تمہیں کیوں برا لگا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"  
 "میں کیوں کرنے لگی۔"  
 "کر لو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"  
 "بہت خوش ہیں آپ؟"  
 "ہاں تو؟ تمہیں اچھا نہیں لگتا۔"  
 "مجھے آپ سے کیا مطلب؟"  
 اسی لمحے کھٹکا ہوا اور فوزیہ بھاگ گئی۔  
 ناصر ہنستا رہا۔ وہ بہت خوش تھا۔

”بہنی اپنی بہن کے پاس بیٹھو۔“ رقیہ درودہ کھول کر اس طرف گئی تو فوزیہ موجود تھی۔ وہ اس سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ وہ دونوں پرانی سیلیاں تھیں۔ کھانے میں فوزیہ کے علاوہ سب شریک تھے۔ کھانے کے بعد میر صاحب چلے گئے اور رقیہ دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور قمر ناصر کے گرد ہو گیا۔

”کیوں جناب یہ کیا پکڑ ہے؟“  
 ”جو بھی آپ لکھ لیں۔“ ناصر سرگٹ جلاتے ہوئے بولا۔  
 ”یہ بڑے تو تمہارے سر پرست ہی بن گئے۔“ قمر جمل گیا۔  
 ”اب دیکھئے وہ کیا کیا کہتے ہیں؟“ ناصر صبر نہ رہا تھا۔  
 ”ہیں۔“ قمر کو جیسے سانپ نے کاٹ لیا۔  
 ”یعنی کیا مطلب؟“

”یعنی کہ وہ ہمارے خسر محترم بھی بن جائیں گے۔“  
 ”اچھا“ قمر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔  
 ”ہاں“ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔“  
 ”اور وہ شادی والی لڑکی۔ یعنی چچا کے ہاں جو لی تھی۔“  
 ”بس اتفاق سے وہی مل گئی۔“ ناصر بے پروائی سے کہنے لگا۔  
 ”اوہو۔“ قمر بھی خوش ہو گیا۔  
 ”تمہیں خوشی ہوئی۔“

”یار مجھے خوشی نہ ہوگی۔ میں تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ قمر ہزیمت میں ہمہ کر کہہ رہا تھا۔

اور ناصر کو اپنی پچھلی زندگی کا عکس نظر آ گیا۔ وہ کچھ کھو سا گیا۔  
 قمر نے اس کو اداس دیکھ کر پھر مذاق شروع کر دیا۔  
 ”مجھے تو ڈر ہے کہ وہ شاید تم کو پسند نہ کرے؟“  
 ”کون؟“ ناصر چونکا۔

”وہ۔“ وہ تو مجھے پسند کر چکی ہے۔“ ناصر کی نگاہوں میں فوزیہ کا معصوم چہرہ

دوسری صبح جب وہ قمر کو لا رہا تھا تو قمر اس کی باتوں پر حیران تھا قمر ٹیکسی ہی میں بولا۔

”تم بہت موٹے ہو گئے ہو۔ کہیں پہلوانی کا شوق تو نہیں ہو گیا۔“  
 ”ہاں۔ ماشاء اللہ بھائی جان کی صحت اچھی ہو گئی ہے۔“ رقیہ نے کہا۔  
 ”بس بھائی۔ کچھ خوراک کھانی شروع کر دی ہے۔“  
 ”اللہ خیر کرے۔“ قمر کے فکر مند لہجے پر ناصر اور رقیہ ہنس دیے۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ڈرائیور بھی ہنس دیا۔

”سناؤ بھئی۔ وہ تمہارے بڑے میر صاحب کیسے ہیں؟“  
 ”ہاں ٹھیک ہیں، لیکن تم اب عزت سے بلایا کرو انہیں۔“  
 ”اب کیوں؟“ قمر نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”بس میں جو کہہ رہا ہوں۔“  
 ”نہ جانے تم کیا کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے تو تمہاری جوانی پر ترس آ رہا ہے۔“

کیسا جوان بچہ، دماغ کا کریمک۔“  
 ”تو بے، آپ کیا اول فول کئے لگتے ہیں۔“ رقیہ نے غصے سے کہا۔  
 ٹیکسی فلیٹ پر پہنچی تو میر صاحب موجود تھے۔  
 قمر حیرت سے ناصر کو دیکھ رہا تھا۔

”کیس شادی تو نہیں کر لی صابرا دے۔“  
 ”تمہارے بغیر کیسے کر لیتا؟“ ناصر ہنسنے لگا۔  
 ”اچھا تو گویا کوئی معاملہ ہے۔“  
 میر صاحب نے آکر باتوں کا سلسلہ ختم کر دیا۔

اور قمر سے باتوں میں لگ گئے۔ رقیہ کمرے میں بیٹھی ہر چیز کو دیکھ رہی تھی کہ میر صاحب نے اسے دیکھ کر کہا۔

پھر گیا۔

”تو یوں کو کہ ‘خوب معاشرہ چل رہا ہے۔“

”نہیں جناب میں شریف آدمی ہوں۔“

”وہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ مولانا ہیں۔“

”اچھا اب سو جائیے تھکے ہوئے ہوں گے۔ میں اس بک بک سے تنگ آ

گیا ہوں۔“

”تنگ آگیا ہوں۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ دل میں تو خوش ہو رہے ہو میں

آپ کی طرح ندیدہ نہیں ہوں۔“

”جی ہاں‘ آپ تو بڑے ہی اچھے ہیں۔“

”اچھا سوئیے گا نہیں۔“ ناصر نے ڈانٹ کر کہا۔

”کیوں؟ یہ سونے کی کیا جلدی ہے۔“

”تاکہ تصورات کی دنیا جلد آباد ہو جائے۔“ ناصر مسکراتے لگا۔

”یہ بات بہتر ایک تصورات کی دنیا تم ہی آباد کرتے ہو اور کوئی نہیں۔“

”نیرت ہے اب تم کون سے تصور میں ہو۔“ ناصر ہنسنے ہوئے بولا۔

”میرے تصور۔ تم کیا جانو۔“ قرنہ ٹھنڈی سانس لی۔

”بتاؤ تو سہی کہیں کوئی لڑکی پسند آگئی۔“

”نہیں یار میرے تصور میں تو نہ سننے سے بچے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کبھی

میں بچے کو لے کر باہر جا رہا ہوں کبھی اس کو کھلا رہا ہوں۔“

ناصر زور سے ہنسنے لگا اور پھر نہ جانے کب تک دونوں دوست باتیں کرتے

رہے۔

☆☆☆

میر صاحب کو نہ جانے کیا ہوا کہ بیمار پڑ گئے۔

معمولی بخار کے بعد دمہ کے مرض نے بری طرح حملہ کیا اور وہ چارپائی سے لگ گئے۔

فوزیہ اور رقیہ سارا دن نجادداری کرتی رہیں۔ ناصر اور قرنہ بھی اپنا زیادہ دقت میر صاحب کے علاج میں صرف کرتے گئے۔

اور میر صاحب کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان کا آخری وقت آگیا ہے۔ وہ

حیرت سے ہر وقت فوزیہ کو نکا کرتے اور فوزیہ کا گلہ پی چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ وہ بڑی

پریشان تھی۔ باپ کو دیکھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں آپ ہی آپ جھجک جاتیں۔

فوزیہ اور رقیہ میر صاحب کے پاس بیٹھی تھیں کہ قرنہ اور ناصر دفتر سے

آگئے۔

”کیسی طبیعت ہے اب میر صاحب؟“ ناصر نے پوچھا۔

”اچھا ہوں بیٹا کاظمی صاحب بھی آئے تھے۔“

”ہاں‘ آج رات کو کچھ صاحب بھی آ رہے ہیں۔ کھانے پر سالانہ تقریب

ہے۔“ ناصر نے بتایا۔

”ہاں یہ تقریب بڑی اچھی ہے۔ تمام رپورٹر اور اخباروں کے نمائندے

اور بڑے بڑے لوگ شرکت کرتے ہیں۔“

فوزیہ اور رقیہ کھانے کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ ناصر نے دیکھا کہ فوزیہ کا

پھول سا چہرہ مرتھسا گیا ہے اور وہ اپنے دل میں دکھ محسوس کرنے لگا۔

”بیٹا“ میر صاحب کی آواز کانپ گئی۔

”جی فرمائیے۔“ ناصر نے کہا۔

”میں بہت دنوں سے یہ بات کہتا چاہ رہا ہوں۔ لیکن موقع نہیں ملا۔ مجھے

اپنی زندگی کی اب امید نہیں رہی نہ جانے کب سانس بند ہو جائے اور فوزیہ کا

میرے اور خدا کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ میں چاہتا ہوں اپنی زندگی میں ہی

فوزیہ کے ہاتھ پیلے کر دوں۔“ میر صاحب بات پوری بھی نہ کر سکے۔ انہیں

کھانسی آئی اور دم اٹنے لگا۔ ناصر نے اٹھ کر پانی پلایا۔ اور سینے پر ہاتھ پھیرنے

اور قمر نے چند لوگوں کو بلایا تاکہ میر صاحب کی خواہش پوری کر دی جائے اور پھر دودھ پر کو فوزیہ کا نکاح ناصر کے ساتھ ہو گیا۔

فوزیہ یونہی میلے کپڑوں میں تھی اور رو رو کر اس کی آنکھیں سوچ مچی تھیں۔ میر صاحب گاؤں نکلنے کے سارے پلک پر لیٹے تھے۔ رقیہ کی بھیجی بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ فوزیہ دلہن بنے لیکن فوزیہ چپ چاپ تھی۔

میر صاحب کو بھی فوزیہ کا یوں بیٹھ رہنا برا سا لگ رہا تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”رقیہ میری بیٹی کو دلہن بناؤ۔“

رقیہ نے فوزیہ کو دلہن بنایا اور اس کا سوگوار حسن چمک اٹھا۔ میر صاحب نے دیر تک گلے لگائے رکھا اور پھر ناصر کو بلوا کر اپنی چمک بک اس کے حوالے کر دی۔

”میاں یہ میری طرف سے“

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔“ ناصر سر جھکاتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ سب کچھ تمہارا ہے بیٹا یہ میں نے اپنی بیٹی کے لئے رکھا تھا۔ پانچ ہزار میں جمع کر سکا۔ اتنے مجھ سے ہوئے ہیں۔“

ناصر نے شکرے کے ساتھ چمک بک لے لی اور ایک اپشتی سی نگاہ جھکی ہوئی فوزیہ پر ڈالی جس کی پلکوں پر موتی چمک رہے تھے۔ وہ بیتاب سا اٹھا۔ اور میر صاحب کے سامنے اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شام تک سمان چلے گئے۔

میر صاحب کی حالت پہلے سے بہتر تھی اور فوزیہ بھی کچھ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ رقیہ بے چاری کام میں لگی تھی اور قمر کو بھی جوت رکھا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اس نے ناصر سے کہا۔

”تمہارے حق میں میر صاحب کی بیماری فائدہ مند ثابت ہوئی۔“

”کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔“

”شکر کرو یا ر جلدی میں کام ہو گیا۔“

”بڑے نامقول ہو۔“

”دل میں تو خوش ہو۔“ قمر مسکرایا۔

لگا۔

”آپ ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ پھر سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہوگا۔“

”نہیں بیٹا۔ اب میں اچھا نہیں ہوں گا۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ میں زیادہ دن جی نہیں سکوں گا۔“

”جو آپ چاہتے ہیں وہی ہوگا۔“ قمر نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

”تو بیٹا پھر جلدی کرو۔ میں آج ہی اپنی فوزیہ کو دلہن بنانا چاہتا ہوں۔ میری حسرت دل میں نہ رہ جائے۔ جلدی کرو بیٹا“

ناصر خاموش بیٹھا رہا اور قمر میر صاحب کو تسلی دیتا رہا۔ دفتر کی سالانہ تقریب آج رات ہی ختم ہو جائے گی۔ کل نکاح کر دیا جائے گا۔

میر صاحب چپ ہو گئے۔ قمر نے رقیہ کو ساری بات سمجھادی۔

رقیہ اکیلی ہی انتظام کرنے لگی۔ فوزیہ کو جب معلوم ہوا تو وہ بہت روئی۔ وہ دودھ کر گئی اور باپ کے سینے سے لگ گئی۔

دونوں باپ بیٹی کی آنکھیں برسے لگیں۔ کمرے میں اور کوئی نہ تھا۔

ناصر نے فوزیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ خواہ مخواہ رنج کرتی ہیں۔ میر صاحب بالکل اچھے ہو جائیں گے۔“

قمر نے آکر اسے بری طرح غورا۔ تب وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا رات کو ناصر اور قمر دفتر کی تقریب میں چلے گئے۔

اور فوزیہ اپنے باپ کو بکیتی رہی۔

☆☆☆

دوسرے دن میر صاحب کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔

”دیکھو، قبر ایک بات مانو گے؟“ ناصر نے التجا کی۔

”کو۔“ قبر رعب سے بولا۔

”وہ ذرا۔ فوزیہ کو۔ اس کمرے میں تو بلاؤ۔“

”بڑے بے صبر سے ہو۔ اس کا باپ بیمار ہے وہ کیسے آسکتی ہے۔“

”دراصل میں اسے تسلی دینا چاہتا ہوں۔ یار وہ بڑی ہی پریشان ہے۔“

”اچھا تم فکر نہ کرو میں خود تسلی دے لوں گا۔“ قبر نے لگا۔

”نہیں تم یہیں بلا دو۔ میری تسلی اور تمہاری میں فرق ہے۔“

”واقعی۔ بہت ہی بے صبر سے آوی ہو۔ اچھا میں رقیہ سے بات کرتا

ہوں۔“

قبر نے رقیہ سے بات کی تو رقیہ نے اس سے کہا کہ یوں تو اچھا نہیں لگتا۔

میں اسے آرام کرنے کے لیے کمرے میں بھیجتی ہوں۔ ناصر بھیجا کو بھی بھیج دیجئے

اور رقیہ کے کہنے پر فوزیہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور ناصر بھی آہستہ آہستہ قدم

اٹھاتا ہوا کمرے میں آگیا۔

”فوزیہ“

فوزیہ نے اسے دیکھ کر سر جھکا لیا۔

وہ قریب آیا تو فوزیہ سسک پڑی۔

”پگلی۔“ اس نے اس کا سراپے بیٹے میں چھپا لیا اور چھپتپاتا لگا۔

”خدا کے لیے اپنے آپ کو سنبھالو۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ۔“ وہ

دیر تک تسلیاں دیتا رہا۔ پھر اس نے فوزیہ کا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا۔

”تم آج دلن بنی ہو پتہ ہے تمہیں۔“

فوزیہ آنسوؤں کے درمیان مگرا دی۔

”تم کتنی خوبصورت ہو۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

انہیں پتہ نہ تھا کہ یہ چند ساتیں ان کی زندگی کا سرمایہ بن کر رہ جائیں گی

اور یہ خوشیاں بھی چھن جائیں گی۔ اسی وقت قبر نے ناصر کو آواز دی۔ ”ناصر

یہاں آؤ۔“

فوزیہ چونک گئی کیونکہ قبر گھبرایا ہوا تھا اور ناصر اس کو چھپتپاتا ہوا باہر نکل آیا۔

”قبر“ ناصر کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

”کیا ہے“

”وہ میر صاحب کی حالت خراب ہے اور پھر سب دوڑے دوڑے میر

صاحب کے کمرے میں آئے جو جاکنی کے عالم میں تھے۔ فوزیہ کی چیخیں ابھرنے

لگیں اور میر صاحب اسے گلے لگا کر بیٹھ کے لیے چھوڑ گئے۔ فوزیہ بے ہوش

سی ہو گئی۔ تمام محلہ اکٹھا ہو گیا۔ رقیہ بمشکل اسے سنبھال سکی۔

اور رات تک میر صاحب کو دفن کر دیا گیا۔ فوزیہ یاس کا ایک بیکر بن کر

رہ گئی۔ سرخ پڑے جن پر شکلیں پڑ گئی تھیں پہنے ہوئے تھی۔

☆☆☆

اور پھر تین دن تک ناصر فوزیہ کو نہ دیکھ سکا۔ نہ ہی تسلی دے سکا۔ کیسی

ہوئی تھی اس کی شادی، ہر حال وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ میر صاحب کا اسے

رہنچ تھا لیکن اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ میر صاحب کا غم فوزیہ کے دل سے اپنی

محبت سے دور کر دے گا۔ وہ قبر سے کہنے لگا۔

”قبر فوزیہ کو تو سمجھو یہاں۔ میں اس سے۔“

ابھی وہ بات پوری بھی نہ کر سکا کہ چڑاسی دوڑ کر آیا۔

”صاحب“

”کیا ہے۔ خیریت؟“ ناصر نے پوچھا۔

”آپ کے مہمان آئے ہیں۔ دفتر آئے تھے۔“

”میرے کون مہمان ہو سکتے ہیں۔“ ناصر سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔

انہی۔

”ناصر کے ابا جان لیکن انہوں نے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔“ وہ صرف ایک نگاہ قرقر وال کر رہ گئی اور قراس کی اس نگاہ سے ہی اس کے دل کی حالت سمجھ گیا۔

رقیہ نے کھانا وغیرہ بھجوا دیا۔ اس عرصے میں ناصر گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اکبر علی اور نسرین کھانا کھاتے رہے۔ قرقر آگیا اور اکبر علی اس کو بتانے لگے کہ وہ کس طرح ناصر کے لیے پریشان رہے ہیں۔

”آپ کو پتہ کیسے چلا میاں کا۔“ قرقر پوچھ ہی بیٹھا۔ اکبر علی نے بیک سے اخبار نکال کر دکھایا۔ اخبار میں ناصر کشز کے ساتھ کھڑا تھا اور ساتھ کئی ایک تقریب کی تصویریں تھیں۔ تب ناصر کو احساس ہوا کہ وہ تقریب اس کی بربادی کا باعث بنی۔ شام تک وہ اسی کمرے میں بیٹھے رہے۔ یکایک ناصر کو خیال آیا کہ وہ کیوں نہ فوزیہ کو لے کر کہیں چلا جائے۔ نسرین انہی ہے۔ اب وہ اس کا چچیا نہیں جھوڑے گی اور فوزیہ کو جب معلوم ہوگا تو وہ اس سے نفرت کرنے لگے گی۔ وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔ قرقر دروازے پر ہی مل گیا۔ ”کیا فوزیہ کو پتہ چل گیا؟“ ناصر نے سرگوشی کی۔

”نہیں اسے پتہ نہیں لیکن وہ پوچھ رہی تھی کہ عورت کون ہے؟“

”پھر تم نے کیا کہا.....؟“

”میں نے کہا میں نہیں جانتا۔ شاید ناصر کی کوئی رشتہ دار ہے۔“

”اب کیا ہوگا قرقر؟“ ناصر کی رگت اڑی گئی تھی۔

”میں کہیں چلا جاؤں فوزیہ کو لے کر۔ قرقر تم تو جانتے ہو کہ نسرین مجھے چین نہیں لینے دے گی اور پھر ابا جان۔ آہ فوزیہ۔ ناصر کو فوزیہ کا خیال پریشان کر رہا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکے گا ناصر۔“

”تو پھر یہ سمجھو میری زندگی پھر وہ جنم اور اب تو میرے ساتھ اور زندگی

باہر پہنچ کر وہ بھونچا رہ گیا۔ سامنے اکبر علی، نسرین کھڑے تھے۔

”ہی!“ اکبر علی ناصر کو دیکھ کر بے قابو ہو گئے۔ اس سے لپٹ گئے۔ ناصر بھی باپ سے بھل گیا ہو گیا۔

نسرین پاس کھڑی تھی۔ ”آئیے اوپر“ ناصر پریشانی سے بولا۔ اتنے ہی قرقر بھی نیچے آگیا۔ نسرین اور اکبر علی کو دیکھ کر وہ بھی گھبرا گیا۔ ”آداب بچا جان“

”اوہ، قرقر!“ اکبر علی نے قرقر کو گلے لگا لیا۔

”آداب بھائی کتنے آپ کے مزاج تو ٹھیک ہیں۔“ قرقر نے نسرین سے پوچھ لیا۔

”شکریہ بھائی صاحب وہ نیکی میں سلمان ہے اتروا لیجئے۔“ قرقر نیکی سے سلمان اتروانے گیا تو ایک عورت پچ لے بیٹھی تھی اور قرقر دل ہی دل میں کرا رہا۔

ناصر سہما سہما اوپر آیا۔ اکبر علی نے شکایتوں کا دفتر کھول دیا، لیکن نسرین خلاف توقع چپ تھی۔ وہ مسکرا کر ناصر کی طرف دیکھ رہی تھی اور ناصر کی پریشانی بار بار پیسے سے تر ہو جاتی تھی۔ قرقر سلمان اتروا کر اوپر لایا اور ساتھ ہی آیا بھی بچی کو لے آئی۔

”ناصر بیٹا بتاؤ بھلا یہ کون ہے؟“ اکبر علی نے پیاری سی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

اور ناصر نے سر جھکا لیا۔ آیا بچی کو ناصر کے سامنے لے گئی۔ بچی منہ بسورنے لگی۔ وہ ناصر کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی شاید۔

”یہ ان کو کیا پیچانے۔ ادھر لاؤ تم اسے۔“ نسرین نے پہلی مرتبہ تیر چھوڑا۔ بچی نسرین کے پاس چلی گئی اور قرقر دوسرے دروازے سے نکل کر رقیہ کے پاس چلا گیا۔

”کون آیا ہے؟“ رقیہ نے پوچھا۔

”ناصر کے ابا جان“ قرقر بے حد پریشان تھا۔

”کھانا کھائیں گے نا۔“ رقیہ نے کہا اور پاس بیٹھی ہوئی سوگوار فوزیہ چونک



”یہ، آپ کو سن کر خوش ہوگی۔ یہ ناصر بھائی کی بیوی ہیں۔“ رقیہ کو جیسے کچھ معلوم نہ تھا۔ ہنس کر کہنے لگی۔

”بیوی ہیں۔“ نسرین نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ”اور ناصر میرا بھی تعارف اپنی بیوی سے کروا دو۔“ ناصر چپ چاپ کھڑا رہا۔

”ہاں، ناصر بھائی، بتائیے نا۔ ان کا بھی تعارف ہم سے کروائیے۔“ رقیہ سہمکراتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ میرا تعارف نہیں کروا سکتے۔ میں خود ہی بتا دیتی ہوں۔ یہ میرے شوہر ہیں اور اس بچی کے باپ۔“

رقیہ پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ صرف ہکلا کر رہ گئی۔

اور فوزیہ کو ایسے معلوم ہوا جیسے کھٹکلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ چکرا سی گئی اور ستون کو تھام لیا۔ ناصر باہر چلا گیا اور نسرین وہیں پر کھڑی فوزیہ کے دل پر چر کے لگاتی رہی۔ رقیہ کی آنکھوں میں آنسو پھل رہے تھے۔ رات تک یہ خبر اکبر علی کو بھی مل گئی۔ وہ بھی حیران سے ہو گئے۔ اور ناصر تو نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ کافی رات تک وہ واپس نہ آیا تو قمر کو فکر ہوئی۔ وہ ہر جگہ ڈھونڈ آیا۔ فوزیہ اپنے کمرے میں خاموش پڑی رہی۔ رقیہ گم سم تھی۔ نسرین خوش تھی۔“

نسرین ناصر کے جانے کے بعد حامد میں دلچسپی لینے لگی اور اب تو وہ حامد سے شادی کرنے پر تیار تھی۔ اسے ناصر کا انتظار تھا کہ وہ اس سے طلاق لے اور اپنے سر کی مخالفت کے باوجود حامد سے بیٹھیں بڑھاتی رہی۔ نغمہ کی اسے خاص پروا نہ تھی اور کتنے عرصے بعد جب اس نے اخبار میں ناصر کی فوٹو دیکھی تو خوش ہو گئی اور اکبر علی کو بھی اخبار دکھایا۔ اکبر علی اس دن تیار ہو گئے۔ اکبر علی کو اس کے ارادوں کا علم نہ تھا کہ وہ کس لیے جا رہی ہے۔ وہ دونوں کراچی پہنچ گئے۔ یہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ نسرین کا ارادہ تھا کہ وہ ناصر سے طلاق لے لے گی لیکن ناصر کی بیوی کو دیکھ کر وہ جل گئی۔ ناصر کے ساتھ نہ تو اسے کوئی محبت تھی نہ کوئی لگاؤ۔ بلکہ اب تو اس نے حامد سے وعدہ کیا ہوا تھا۔ نہ جانے ایسے

بھی وابستہ ہے۔ قمر مجھے اپنے لیے نہیں اس کے لیے جینا ہے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو آج میں کچھ بھی کر لیتا لیکن فوزیہ جس کا خدا کے سوا کوئی نہیں۔“

”تو پھر کیا کر گئے۔“ قمر نے آہستہ سے پوچھا۔

”چلو فوزیہ کے پاس۔“ وہ دونوں آہستہ سے فوزیہ کے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اس طرف چلے گئے اور اندر دو آنکھیں انہیں گھور رہی تھیں اور پھر آنکھیں ان کا تعاقب کرتے ہوئے اس طرح پہنچ گئیں۔ ناصر جب اندر گیا تو فوزیہ کمرے میں لیٹی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ ”فوزیہ“

”جی“ وہ آہستہ سے بولی۔

”فوزیہ چلو اسی وقت کیس چلیں، نہیں تو پھر۔ نہ جانے کیا ہو جائے۔“

وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ فوزیہ بھی لرز سی گئی۔

”آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔ خیرت ہے نا۔“

”فوزیہ“ ناصر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑا۔

”میں بہت بد نصیب ہوں۔ میں گنگار ہوں۔ میں نے تم کو بھی نہ بتایا اور

اب وہ آگئی۔ میں تمہارا قصور وار ہوں۔ وہ مجھے چین نہیں لینے دے گی۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ فوزیہ کلپ گئی۔

نسرین کی آواز سے ناصر چونک پڑا۔ وہ رقیہ سے پوچھ رہی تھی کہ ناصر

کہاں ہے۔“

ناصر باہر نکل آیا اور ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی فوزیہ بھی۔

”ناصر تم نے ان کا تعارف نہیں کروایا۔“ وہ رقیہ کی طرف اشارہ کر کے

بولی۔

”یہ قمر کی بیوی رقیہ ہیں۔“ وہ بے بسی سے کہنے لگا۔

”اچھا قمر بھائی نے شادی کر لی۔“ وہ حیرت سے بول رہی تھی کہ اس کی

نظر فوزیہ پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

”اور یہ کون ہیں؟“ اس کی انگلی فوزیہ کی طرف اٹھی۔

”یہ۔ یہ۔“ ناصر ہکلا سا گیا۔



ناصر چونکہ رات کو دیر تک جاگتا رہا تھا۔ اس لیے صبح نہ اٹھ سکا۔ وہ ابھی سو ہوا تھا کہ نسرین نغمہ کو لے کر فوزیہ نے پاس بٹھیں۔ رقیہ ناشتہ کے انتظام میں لگی ہوئی تھی۔

فوزیہ کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔ شاید رونے سے یا جاگنے سے۔ وہ نسرین کو سہی ہوئی دیکھتی رہی۔ نسرین نے نغمہ کو اسکی گود میں دے دیا اور گویا ہوئی۔

”میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ گو تم بہت خوبصورت ہو اور ناصر کو تم سے محبت نہیں ہو سکتی لیکن اس بچی کو تو باپ کی ضرورت ہے۔“ فوزیہ گم سم بچی کے ساتھ کھیتی رہی۔

ناصر مجھے یہ دے کر میاں چلا آیا۔ اس سے پیشتر بھی وہ ایک لڑکی کی زندگی برباد کر چکا ہے۔ میں اس کی جدائی میں پاگل ہو گئی اور اسے ڈھونڈتی رہی۔ جب وہ مجھے ملا تو اس طرح کہ وہ مجھ سے چھن چکا تھا۔ کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ شادی شدہ ہے؟“

”نہیں۔“ فوزیہ نے آہستہ سے کہا۔

”تو پھر تم اس بات سے اندازہ کر لو کہ وہ کتنا دھوکا باز ہے۔“

فوزیہ صرف نظریں اٹھا کر رہ گئی۔ ورنہ اسے ناصر سے کوئی خاص گلہ نہ

تھا۔

”رات وہ دیر تک مجھ سے معافی مانگتا رہا۔ میاں تک کہ وہ تمہیں چھوڑنے

لوگ باطن میں کیوں ذلیل ہوتے ہیں۔ ناصر کا کوئی قصور بھی نہ تھا لیکن وہ ناصر کو ستا کر خوش ہوتی تھی اور اب بھی وہ خوش ہو گئی کہ ایک ہمانہ اس کے ہاتھ آ گیا۔ لیکن اور ہی سیکیم بنا کر وہ اور بھی خوش تھی۔ ناصر کو پریشان کرے گی۔ ناصر اور فوزیہ کو جدا کر دے گی اور پھر خود بھی کنارہ کش ہو جائے گی۔ ناصر کا قصور یہی تھا کہ وہ کیوں نہ اس سے محبت کر سکا۔ کیوں اس کے نام پر بیٹھا رہا اور ادھر ناصر آدھی رات تک کلنٹن میں دور ریت پر بیٹھا رہا اور پھر بہت رات کے بعد اسے فوزیہ کا خیال گھبرلے آیا۔

وہ فوزیہ کے دروازے پر آیا۔ دیکھا اندر رقیہ اور فوزیہ سو رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

اور لیٹ کر سوچنے لگا۔ نسرین کو طلاق دے دینی چاہیے۔ میں صبح ایسا ہی کروں گا اور ارادے باندھے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن نیند آنکھوں سے دور تھی۔



رہی ہے۔ نسرین اپنے سوال کا جواب نہ پا کر اکبر علی کے پاس گئی اور اسے کہنے لگی۔

”چچا جان۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”ناصر کے لیے۔“

”جی ہاں۔“

”اے اپنے ساتھ لے چلے کی کوشش کرو۔“

”مگر ان کی نئی بیوی صاحبہ؟“

”وہ کیسی ہے؟“

”بہت خوبصورت ہے اور ساتھ ہی کچھ بھولی بھی۔ بھولی کہنے کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے آپ۔“ نسرین نے صاف بات کی۔

”تم نے اس سے کچھ کال۔“ اکبر علی نے پوچھا۔

”میں نے بت کہا۔ بچی کے واسطے دیئے لیکن وہ میری نہیں مانتی اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی بات مان جائے گی۔“

”میری بات۔“ اکبر علی کی پرانی لالچ عود کر آئی۔

”جی ہاں۔ اور پھر نسرین نے فوزیہ کی اور اپنی گفتگو اکبر علی کے گوش گزار کر دی اور اکبر علی کی نگاہوں میں کاریں، کوشیاں، اور روپیہ پھرنے لگا اور ایک بار پھر اس دولت نے انہیں بد گمان کر دیا۔ وہ پھر بیٹے کی زندگی اجاڑنے پر راضی ہو گئے۔ پھر بیٹے کی خوشیاں جھین لینے پر آمادہ ہو گئے۔

ناصر ابھی تک اٹھا نہ تھا۔ قرد و تر جا چکا تھا اور رقیہ ناشتہ لگا رہی تھی۔ اکبر علی نسرین کے ساتھ اٹھ آئے اور رقیہ سے کہنے لگے۔

”مجھے ناصر کی بیوی سے ملا دو۔“

رقیہ کچھ سہم سی گئی لیکن اکبر علی کو فوزیہ کے کمرے میں لے گئی۔ جو اب تک کتبہ پر منہ رکھے سسکیاں لے رہی تھی۔

نسرین باہر رہی تھی۔

”فوزیہ۔“ رقیہ کی آواز سے اس نے سر اٹھایا اور اکبر علی کو دیکھ کر سنپٹنے

پر تیار ہو گیا ہے۔“

”ہیں۔“ فوزیہ کانپ ہی گئی۔

”ہاں میری بہن۔ آج اس نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔ مجھے خود تم پر ترس آ رہا ہے۔“ اور پھر فوزیہ رو دی۔ دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔

نسرین نے پھر کہا۔ ”تم نے اپنے لیے سوچا ہے۔ کیا تم بھی اس پر راضی ہو؟“

”میں۔ میں۔ خدا کے لیے انہیں منع کر دیں۔ میں زندگی بھر آپ کی خدمت کروں گی۔ مجھے اپنے گھر کے کونے میں جگہ دے دیجئے۔ لیکن ایسا نہ کہنے میں جاؤں گی۔“ آخر فوزیہ نہ رہ سکی۔

”لیکن میں اسے بالکل برداشت نہ کر سکوں گی۔ مجھے محبت نہ مل سکے گی۔ نعمانہ کو باپ کا پیار نہ مل سکے گا۔ تم ہمارے درمیان رہو گی۔ ہم کبھی نہ رہیں گے۔“

”میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ میں کبھی تمہارے درمیان نہیں آؤں گی۔ میں ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔ میں کبھی شکل نہیں دکھاؤں گی۔ آپ ہی بتائیں کہاں جاؤں۔“ فوزیہ سسک پڑی۔

”اگر تمہیں میرا خیال نہیں تو اس بچی کا خیال کرو۔“ نسرین بچی کے واسطے دے رہی تھی۔

”میں کیا کروں؟ آخر آپ ہی بتائیے۔“ فوزیہ روتی ہوئی کہنے لگی۔

”تم کہیں بھی چلی جاؤ، میں تمہیں اتنا روپیہ دے دوں گی کہ تم جہاں جاؤ تمہاری بھرہو سکے گی۔“

فوزیہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

”یہ باتیں کسی سے کہو گی تو نہیں۔“ نسرین کو خدشہ تھا کہ اس کی یہ سکیم کامیاب ہو سکے گی اور واقعی فوزیہ کو یوں لگا جیسے وہ جھوٹ بول رہی ہے غلام کہہ

میں برباد ہو جاؤں گی۔ لیکن آپ کی عزت تو رہ جائے گی نا۔ میں چلی جاؤں گی چلی جاؤں گی۔" نہ جانے وہ کیا کہتی رہی۔

اکبر علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے بنی۔" "جی ہاں" یہ دعا تو آپ کی مجھے ضرور ملے گی۔" اور اکبر علی کے دل پر چوٹ لگی۔

فوزیہ نے اکبر علی کے سامنے اپنا برقعہ اٹھایا، پٹنا اور ایک نظر اکبر علی پر ڈالیں اور تیز تیز باہر نکل گئی۔

اسے باہر جاتے ہوئے رقیہ نے دیکھ لیا۔ وہ دوڑی۔

"فوزیہ۔ فوزیہ۔ کہاں جا رہی ہو؟"

"اسے جانے دو بنی۔" اکبر علی کی آواز گونجی۔

"وہ کہاں جائے گی چچا جان۔ آپ کچھ تو خیال کیجئے۔"

"وہ کہیں بھی چلی جائے گی عزیزوں میں۔" اکبر علی نے کہا۔

"اس کا کوئی عزیز نہیں وہ تھا ہے۔" رقیہ رو پڑی۔

"اس کا کوئی نہیں واقعی؟" اکبر علی کو حیرت ہوئی۔

"ہاں چچا جان۔ جائے۔ اسے روکے۔"

اکبر علی کا دل بھی ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ فوزیہ کی معصومیت، اس کی

سعادت مندی۔ پھر وہ بیڑھیوں کی طرف لپکے۔ اور رقیہ کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

فوزیہ رکشا میں بیٹھ چکی تھی اور رکشا بیڑھ میں گم ہو گیا۔

"افو۔ اب کیا ہو گا؟" نسرین بھی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔

ناصر بھی شور سن کر جاگ گیا۔ رقیہ اس کو جگانے کے لیے بھاگی۔

"کیا بات ہے بھالی؟" ناصر نے بھائی لپٹے ہوئے کہا۔

"بھیا۔ جلدی کرو۔ فوزیہ کہیں چلی گئی ہے۔"

"ہیں۔" ناصر چونکا۔

"ہاں بھیا۔ آپ کے والد اور نسرین نے اسے نہ جانے کیا کیا کہا ہے۔"

"افو۔" ناصر سر تھام کر رہ گیا۔

گئی۔

"یہ ناصر بھائی جان کے ابا جان ہیں۔" رقیہ نے تعارف کروایا۔

"آداب۔" فوزیہ نے سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اٹھائیں۔

ایک لمحے کے لیے اکبر علی تڑپ سے جمے۔ کتنا صحیح انتخاب کیا تھا اس کے بیٹے نے۔ کتنی معصوم تھی وہ۔ اکبر علی نے فوزیہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھیں پھر آئیں اور اس ہاتھ میں نہ جانے کیا چادو تھا کہ وہ رو دی۔

رقیہ باہر چلی گئی اور اکبر علی پھر سیر پچھ بھول کر مخاطب ہوئے۔

"بنی۔ تیرے پاس ایک نرسن ہے کہ آیا ہوں۔ امید ہے کہ تم مجھے اپنے

باپ کی جگہ جان کر میری بات نہ ٹالو گی۔"

فوزیہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

"بنی۔ تم نہیں جانتیں کہ آج جتنی عزت کا میں مالک ہوں۔ وہ صرف

نسرین کی وجہ سے ہے۔ اگر نسرین بگڑ گئی تو میری عزت خاک میں مل جائے گی

اور میں زندہ نہ رہ سکوں گا اور پھر ناصر کی کیا ہم سب کی قسمت کی ڈور اس

وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"میرے ہاتھ۔" فوزیہ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں بنی۔ نسرین ہے نہیں چاہتی کہ تم رہو۔ تم چاہو تو میری عزت بھی بچ

سکتی ہے اور ناصر بھی سبھی رہ سکے گا۔"

"میں کیا کروں۔" فوزیہ بے چارگی سے بولی۔

"تم ناصر کی زندگی سے علیحدہ ہو جاؤ۔" اکبر علی بمشکل بولے۔

"میں۔" فوزیہ کانپ گئی۔

"ہاں میں تمہیں اپنی عزت کا واسطہ دیتا ہوں اب جبکہ تم میری بہو بن چکی

ہو۔ میری عزت نبھانا تمہارا کام ہے۔ کیا تم یہ دیکھ سکو گی کہ ناصر کا باپ خود

کشتی کر لے اور ناصر۔"

"ہاں کیجئے آپ جو کہتے ہیں۔ وہی ہو جائے گا۔ میں کہیں چلی جاؤں گی۔"

”آپ جلدی کیجئے۔ جا کر اسے ڈھونڈیئے۔“

ناصر گھبرا کر اٹھا اور سلیپنگ سوٹ میں ہی نیچے اتر گیا۔ رکشا لے وہ پریشان ادھر ادھر بھاگتا رہا۔ تھر کو بھی خبر ہو گئی۔ وہ بھی بچا وغیرہ کے ہاں بھاگا۔ اکبر علی بڑے شرمندہ تھے۔ نرسن مطمئن تھی۔ رقیہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔

شام کو قمر ناصر کو لے آیا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور صبح سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ باپ کو دیکھ کر چیخ پڑا۔

”آپ بڑے ظالم ہیں۔ اس نے خود کشی کر لی ہوگی۔ میں ہر جگہ ڈھونڈ آیا ہوں وہ نہیں ملی۔“ اور آج ناصر بیچوت بیچوت کر رونے لگا۔

اکبر علی کا دل چاہا کہ وہ اس وقت کو دور کر جائیں۔ ایک بیٹا جس کو ماں بن کر پالا اور اس کی خوشیوں کو اپنے ہاتھوں سمار کیا۔ واقعی وہ ظالم ہے اور ایک معصوم لڑکی نہ جانے کہاں گئی۔ اس کے ساتھ کیا ہو۔“

وہ نرسن پر برس پڑے۔ ”تم نے مجھے کہا۔ اس کے نکالنے کے لیے تم نے کہا۔ تم عورت نہیں ناگن ہو۔“

”اوہو۔ آپ تو سچے ہیں نا۔ جو میرے درغلانے میں آ گئے۔“ اور اکبر علی کو اس وقت واقعی احساس ہوا کہ یہ اونچی جگہ کیسی پست ہے اور اس لالچ نے انہیں تباہ کر دیا ہے۔ وہ ناصر کو گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے، لیکن ناصر آگے بڑھ گیا۔

”آپ یہاں سے چلے جائیے۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔“

”میں تم سے معافی مانگتا ہوں بیٹا۔ واقعی میں غلط کیا۔ تم نگر نہ کرو۔ میں فوزیہ کو ڈھونڈنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھوں گا۔“

اور ناصر حیرت سے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔

ابھی تک پریشانی دور نہ ہوئی تھی کہ نرسن نے سر اٹھایا۔

”میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“

اس سے کسی نے کچھ نہ کہا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے کی طرف چلی گئی۔

سب ہی پریشان تھے اور ناصر کا حال تو الگ تھا۔

وہ پہلے تو کھڑکی میں کھڑا رہا اور پھر نہ جانے دل میں کیا آئی۔ میڑھیاں اتر کر سڑک پر آ گیا۔

ساڑھے بارہ کا نام تھا۔ سڑک پر اکا دکا ٹیکسیاں اور رکشا تڑ رہے تھے۔ وہ کھڑا گھورتا رہا اور پھر میں اسی لمحے اس نے ایک ٹیکسی روکی۔ جب اکبر علی کھڑکی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ناصر ٹیکسی لے کر اولڈ کلفٹن کی طرف چلا گیا اور اکبر علی اپنا دل موسس کر رہ گئے۔

”ان کا اکھوتا بیٹا۔ آہ۔ اس دولت نے ان کا خون سفید کر دیا تھا لیکن اب وہ تڑپ سے گئے۔ وہ بھی میڑھیاں اتر آئے اور دیر تک سڑک پر کھڑے رہے۔“

ناصر اولڈ کلفٹن کی سنسان جگہ پر اپنا دل بھلاتا رہا لیکن اسے اس وقت یہ پتہ نہ تھا کہ ایسی جگہیں تو اور بھی یاد دلاتی ہیں۔ یہاں آکر تو انسان کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔

تین گھنٹے بعد واپس لوٹا اور جب وہ میڑھیاں چڑھنے لگا تو اکبر علی میڑھیوں میں بیٹھے نظر آئے۔

”ابا جان۔ آپ۔“

”میرے بیٹے۔“ اکبر علی کی شفقت بے تاب تھی۔

”اوپر چلئے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

اکبر علی اپنے بچک پر لیٹ گئے۔

اور ناصر بھی سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن فوزیہ کا معصوم چہرہ ایک منٹ بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا۔

”آہ۔ میں کتنا بد نصیب ہوں۔ میرے ساتھ وہ بھی پس گئی۔ نہ جانے کہاں ہوگی۔ فوزیہ خدا کے لیے لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ۔ میری روح تمہارے لیے ہے

تآب ہے۔ لوٹ آؤ۔ فوزیہ۔ ورنہ تمہارا ناصر مر جائے گا۔ وہ پہلے ہی دکھی ہے۔ ایک تمہارے لیے تو وہ بیٹا چاہتا ہے۔“

دیکھنے لگا۔

”ہاں بابا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔  
 ”بچی خیریت تو ہے۔ کہیں تم گھر سے بھاگ کر تو نہیں آئیں۔“  
 ”نہیں نہیں بابا۔ ایسا نہ کہو۔“ وہ لرز گئی۔  
 ”تو پھر کیا معاملہ ہے۔“ رکشا والا بھی ٹوہ میں لگ گیا۔  
 ”بابا۔ مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھو۔ بس یہ انگوٹھی۔“  
 ”انگوٹھی کیوں بیچ رہی ہو؟“ رکشا والے نے بات کاٹ کر کہا۔  
 ”تمہارا کرایہ بابا۔“

”میرے کرایے کی فکر نہ کرو۔ بس مجھے بتا دو کہ تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔  
 دیکھو بیٹی۔ یہ بڑا شر ہے۔ میاں قدم قدم پر تمہارے لیے خطرہ ہے۔“  
 ”بابا۔“ فوزیہ کی آواز گھبراہٹ اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔  
 ”تمہارے برابر میری بیٹیاں ہیں۔ فکر نہ کرو۔ مجھے بتاؤ۔“ رکشہ والے  
 بوڑھے کو بھی ترس آگیا۔

”مجھے نکال دیا گیا ہے بابا، گھر سے۔“  
 ”نکال دیا۔ وہ کیوں۔ کس نے نکالا؟“

”میرے خسر نے۔ وہ بیٹے کے لیے دولت مند بیوی کو پسند کرتے ہیں۔“  
 ”اچھا۔ بوڑھا بڑبڑانے لگا۔ ”تو اب تم کہیں اپنے عزیزوں کے ہاں جا رہی  
 ہو؟“

”میرا کوئی عزیز نہیں۔ میں تو یونی اسٹیشن کا کمرہ بیٹھی کہ کہیں چلی جاؤں  
 گی۔“

”فی الحال بیٹی۔ تم کہیں نہ جاؤ۔ اگر پسند کرو تو میرا گھر حاضر ہے۔ تمہیں  
 ایک ماں بھی لے گی اور بہنیں بھی۔ اس کے بعد کوئی مناسب بندوبست ہو جائے  
 گا تو چلی جانا۔“

فوزیہ کا دل اس ہمدردی سے گھرا گیا۔ اور وہ رونے لگی۔

”کیا خیال ہے بیٹی۔ پھر۔ چلوں۔“

باہرات بھاگ رہی تھی۔

”فوزیہ۔ تم تو میری ذرا سی تکلیف پر رو پڑتی تھی۔ بے تاب ہو جایا کرتی  
 تھی۔ کیا تمہیں اب احساس نہیں کہ تمہارا ناصر تڑپ رہا ہے۔ اسے کسی کل  
 چین نہیں۔ فوزیہ۔“  
 اور فوزیہ۔ فوزیہ کرتے ہی صبح ہو گئی۔ ناصر برسوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا۔

☆☆☆

فوزیہ روتی ہوئی نیچے ازری تو رکشائیں بیٹھ گئی۔ جب رکشا والے نے  
 استفسار کیا کہ وہ کہاں جائے گی تو وہ سٹپا سی گئی۔ تب اسے ہوش آیا کہ کیا کیا  
 جائے۔

اور پھر اچانک ہی اس کے منہ سے نکلا۔ اسٹیشن۔“  
 رکشا سڑکوں پر بھاگنے لگا۔ اور ایک لمحے کے لیے یہ بھی احساس ہوا کہ اس  
 کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ وہ رکشا والے کو کیا دے گی اور کہاں جائے گی۔  
 تب اس کی نظر اس طرف چلی گئی۔ جہاں جگمگاتی ہوئی انگوٹھی تھی جو شادی پر  
 ناصر لایا تھا۔

اس نے رکشا والے سے پھر کہا۔

”بھیا۔ پہلے ذرا سونا بازار چلنا۔“

”اب بتایا ہے۔ جب کتنا راستہ گزر آئے ہیں۔“ رکشا والا بڑبڑایا۔

”سونا بازار آگیا بی بی جی۔“ کچھ دیر بعد رکشا والے نے مخاطب کیا۔

”ہیں۔“ وہ گھرے خیالوں سے چوکی۔

”کہاں روکو؟“

”ہیں۔ بس یہیں روک لو۔“ رکشا رک گیا تو فوزیہ نے انگوٹھی اتار کر

رکشا والے سے کہا۔ ”بابا یہ بیچ آؤ۔ بڑی مہمانی۔“

”میں بیچ آؤں۔“ رکشا والا حیرت سے اس فراخ دل سواری کی طرف

بابا بھی باہر آگیا اور فوزیہ کو تاکید کرنے لگا۔ وہ اسے اپنا ہی گھر سمجھے اور بے فکر ہو کر رہے۔ بابا اپنی بیٹیوں کو تاکید کرتا ہوا چلا گیا۔

بابا جس کا نام غفور تھا۔ رکشا چلایا کرتا اور اپنا چھوٹا سا خاندان پالا کرتا۔ بابا کی چار لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ دو لڑکیاں شادی شدہ تھیں۔ اور لڑکا بھی شادی شدہ تھا۔ جس کی بیوی اس کے لے کر علیحدہ ہو گئی تھی۔

غفور کی بیوی کریمین کچھ چڑچی سی تھی لیکن فوزیہ کو دیکھ کر وہ کچھ سہم گئی۔ ضرور یہ لڑکی کسی بڑے گھرانے کی ہے۔ اس نے اپنے خاوند کو یہاں تک کہہ دیا تھا۔ یہ نہ ہو کہ کوئی مصیبت آجائے۔ پولیس وغیرہ لڑکی کی تلاش میں ہی ہو لیکن غفور نے اس کی ایک نہ مانی۔

فوزیہ ایک اجنبی سی جگہ پر تھی۔ اس کا دل فلیٹ پر تھا۔ ناصر کو جب معلوم ہوگا۔ تو وہ کیا کہیں گے۔ میں نے غلطی کی انہیں کسے بغیر نکل آئی۔ لیکن اکبر علی۔ وہ کیسے اس کا کتنا ٹال سکتی تھی۔ ناصر پہلے دن وہ کتنے گھبرائے ہوئے تھے اور مجھے کہہ رہے تھے کہ چلو۔

”کسین چلے چلیں۔ کاش“ میں اس وقت کسین چلی جاتی۔

”تھکیلے کچھ فلمی رسائل لے آئی۔“

”بابی۔“ بچھے۔ یہ پڑھئے۔ اور وہ یونی رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔

”بابی۔“ اپ کو ویلپ کمار اچھا لگتا ہے۔“ وہ شرما ئی ہوئی سی پوچھنے لگی۔

اور فوزیہ اس کے سوال پر مسکرا دی۔

”میں نے بہت سی تصویریں جمع کر رکھی تھیں اس کی۔ اور اماں سے چوری

اس کی فلم دیکھنے بھی گئی تھی۔“ تھکیلے جیسے فوزیہ کو رازدار بنانا چاہتی تھی۔

”اماں سے چوری۔“ فوزیہ نے پوچھا۔

”وہ جانے جو نہیں دیتیں۔“

”پھر نہ پایا کرو۔“

”پھر کیا کروں؟“

”کیا بہت ضروری ہے؟“

”لے چلو بابا۔ کسین لے چلو۔“ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

اور رکشا پھر کشادہ سڑکوں سے ہوتا ہوا تنگ اور بدبودار گلیوں سے گزرنے لگا۔

اور پھر ایک کچے سے مکان کے سامنے رکا۔

فوزیہ بابا کے ساتھ اندر آئی۔

گھراچھا خاصا چڑیا گھر تھا۔ ایک طرف بکری بندھی تھی۔ صحن میں آٹھ دس مرغیاں پھر رہی تھیں اور ایک اویڑ عمر کی عورت ٹوٹی چارپائی پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔

ایک سانولی سی جوان لڑکی دبیچی میں پیچے چلا رہی تھی۔ بابا کے ساتھ لڑکی کو آتے دیکھ کر وہ آٹھ کھڑی ہوئی۔

”لو۔ اچھن کی ماں۔ تمہاری ایک اور بیٹی آئی ہیں۔ جیسے ہی فوزیہ نے نقاب اٹھایا وہ حیران رہ گیا اور آہستہ سے بولا۔

”خدا کی قدرت کے قربان۔ کسی صورتیں بنائی ہیں اور پھر امیں کیسے کیسے دکھ۔“

فوزیہ سلام کر کے بیٹھ گئی۔ ایک اور سولہ سال کی تھیکے نقوش والی لڑکی شرمٹ بنا کر لے آئی۔

بابا اپنی بیوی کو اندر لے گیا۔ فوزیہ کے بارے سمجھانے لگا اور دونوں لڑکیاں فوزیہ سے باتیں کرنے لگیں۔

بڑی لڑکی جس کا نام جیلہ تھا کچھ شیدہ تھی چھوٹی تھکیلے کی زبان تو قہقہی کی طرح چلتی تھی۔

”بابی۔ برقع اتار دیجئے۔“ تھکیلے آنکھیں گھما ئی ہوئی کہنے لگی۔

فوزیہ برقع اتار کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ابھی صبح ہی تھی اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔

”بابی۔ آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟“

”نہیں بہن۔ کھلف نہ کرنا۔“ فوزیہ آہستہ سے بولی۔



اور اگلی صبح نسرین جانے کی تیاری کرنے لگی۔

سب ہی اسے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ اس نے کسی سے کچھ نہ کہا اب تو کبر علی کو بھی اپنے بیٹے کی فکر تھی اور انہوں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا دولت جاتی ہے تو جائے۔ میرا ایک بیٹا ہے میں اس کی خاطر سب کچھ کروں گا۔ نسرین تیار ہو کر اکبر علی کے پاس آئی۔

”میں جا رہی ہوں بچا جان۔ میں ناصر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“  
 ”کاش“ یہ الفاظ تم اس وقت کہتی۔ ”اکبر علی کو اپنی زیادتی یاد آگئی۔“  
 ”اب بھی سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ نسرین طنزیہ مسکرائی۔ ”میں ناصر سے لاق لینا چاہتی ہوں۔“ وہ رکتے ہوئے بولی۔  
 ”نفرانہ۔“ اکبر علی نے آہستہ سے کہا۔

”نفرانہ آپ لے سکتے ہیں۔“ نسرین کی اس بات پر رقیہ نے منہ میں انگلی اب لی اور قہر بھی حیرت سے اس کو دیکھنے لگا۔

”یہ کسی ماں ہے جو اپنے بیٹے کی خاطر اپنی اولاد کو چھوڑ رہی ہے۔ ماں تو بنی اولاد کی خاطر مرجاتی ہے اور یہ ماں۔“  
 ”آپ نے جو اب نہیں دیا؟“ نسرین کو جلدی تھی۔

”میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔ یہ تو ناصر۔“

”ناصر ہوں۔ یاد رکھئے میں کورٹ میں طلاق لے لوں گی۔“

”تم کورٹ میں کیوں جاؤ گی۔ تم جو چاہتی ہو۔ میں اس کے لیے تیار

”نہیں تو۔“ اور ٹھیکہ کھو سی گئی۔ اسی کے سامنے دلپ کمار کی تصویر تھی اور فوزیہ اس کے ننھے سے دل میں آنے والے جذبے کے بارے میں سوچنے لگی۔

وہ سوچنے لگی۔ کتنی غلطی کرتے ہیں وہ ماں باپ جو لڑکیوں کو بالکل ہی گھروں میں بند رکھتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کے لیے کتنا ضروری ہے۔ ان کے جذبات ان لڑکیوں سے کتنے مختلف ہوتے ہیں جو دنیا دیکھتی ہیں اور اس معصوم سی لڑکی کے جذبات۔ اور جب وہ ماں سے چوری ایک فعل کر سکتی ہیں تو آئندہ کے لیے کچھ بعید نہیں کہ کوئی دوسرا قدم بھی اٹھا لے۔

جیلہ ایک پلیٹ میں۔ اور چنگیز میں پراٹھے پکا کر لے آئی۔  
 ”باجی کے لیے آلو کا سائمن بنالیا ہوتا۔“ ٹھیکہ نے بڑی ہن کو گھورا۔  
 ”نہیں“ میں کوئی صمان نہیں۔ یہی کافی ہے آؤ تم بھی۔“ فوزیہ نے ٹھیکہ کو ساتھ ہی بٹھالیا۔ جیلہ پانی لا کر رکھ گئی۔

اس کی ماں چھالیا کاتھی رہی اور اس کے حالات کرید کرید کر پوچھتی رہی۔  
 ”باجی۔ آپ اندر چل کر لیٹ جائیے۔“  
 فوزیہ ٹھیکہ کے ساتھ اندر کوٹھری میں آگئی۔ ٹھیکہ نے اچلی چاور چارپائی پر ڈال دی اور اس تاریک سی کوٹھری میں جہاں ہر وقت اندھیرا رہتا تھا۔ لیٹ گئی اور اپنی یادوں کے دیپ جلانے لگی۔

اور ان یادوں کی سمیٹ موتی چڑھا رہی تھی۔

”آہ ناصر۔“

میں نے تمہیں اسی دن اپنا دیو تانمان لیا تھا۔  
 نہ جانے کیوں۔ کس لیے۔“



ہوں۔"

"ناصر! تم اس کمرے میں نہ آیا کرو۔"

"وہ کیوں؟"

"تم پاگل ہو جاؤ گے۔ اپنی صورت دیکھ کیا سے کیا ہو گئی۔"

"ہوں۔ میں بڑا سخت جان ہوں قمر! ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

"ایسا نہ کہو۔" قمر دھک سے بولا۔

"میں کیا کروں قمر! نہ جانے فوزیہ مجھے طے لیا نہیں۔"

"وہ ضرور مل جائے گی۔ میں تو ہر جگہ پتہ کرتا ہوں۔ اسکو لوں میں۔

ہسپتالوں میں اور دیگر کئی جگہوں پر میں نے جاسوس چھوڑے ہیں۔"

"ہوں! جھوٹی تسلیاں نہ دلاؤ۔"

نہیں میرے دوست انشاء اللہ فوزیہ مل جائے گی۔"

رقیہ نعمانہ کو لے کر آگئی۔ بھئی جان یہ تو اب آپ کے بغیر نہیں رہتی۔"

نعمانہ نے ناصر کو دیکھ کر ہاتھ پھیلا دیے اور ناصر نے اسے اپنی گود میں لے

لیا اور اس کے بالوں پر پیار کرنے لگا۔

"نہ جانے چچا جان رات کے بارہ بجے آتے ہیں۔"

"ہاں ناصر رات کے بارہ بجے آتے ہیں۔"

"کوئی کام ہوگا۔" ناصر نے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ فوزیہ کو تلاش کر رہے ہیں۔"

"شاید۔" اور وہ سب نعمانہ کی معصوم حرکتوں پر مسکرانے لگے۔

☆☆☆☆

فوزیہ کو غفور کے ہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا۔

جیل اور شکیلہ اس کا دل بدلاتی رہیں لیکن غفور کی بیوی چڑچڑی سی تھی۔

وہ یہ خیال کر رہی تھی کہ ایک اور خرچ آ پڑا ہے سر پر۔

ناصر دوسرے کمرے سے نکل کر بولا۔ اور نسرین کی آنکھیں چمک اٹھیں اور پھر اسی لمحے ناصر نے نسرین کو طلاق لکھ دی اور یہ بھی کہا کہ اگر نعمانہ لے لے جانا چاہے تو لے جاسکتی ہے۔

لیکن نسرین اس قسم کی پتھر دل واقع ہوئی کہ اس نے نعمانہ کو لے جانے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اس کے گال پتھرتپاتی ہوئی میڑھیاں اترنے لگی۔ نعمانہ اپنی آیا کی گود میں تھی۔ قمر نے نسرین کا سامان نیچے پینچا دیا تھا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر الوداعی نظر ڈالتی ہوئی اسٹیشن کی جانب چلی گئی۔

اور ناصر کے دل میں اس وقت بھی ایک ہوک سی اٹھی۔

"آہ! پاگل عورت۔ میں نے کتنی کوشش کی تھی تجھے بنانے کی۔ لیکن تو۔"

پھر اس کی نظر نعمانہ معصوم پر پڑی۔ جو اپنی آیا کے بال کھینچ رہی تھی۔

تب ناصر نے پہلی مرتبہ اس کو سینے سے لگایا اور اسے چومنے لگا۔ اس وقت

رقیہ کی آنکھیں بھیک گئیں۔

☆☆☆☆

نسرین کے جانے کے بعد گھر پر ایک پراسرار سی خاموشی چھا گئی۔ اکبر علی کمرے میں پڑے رہتے یا باہر کچھ دیر کے لیے چلے جاتے۔ رقیہ اور قمر بھی تنہیدہ ہو گئے تھے۔ ناصر دفتر سے گھر آتا اور نعمانہ کے ساتھ کھیلتا رہتا اور پھر رات تک وہ یونی سائل پر گھومتا رہا۔

فوزیہ کی تلاش اس نے چھڑ دی لیکن وہ فوزیہ کو کسی لمحے بھی بھول نہ پاتا۔ اکثر راتوں کو وہ بالکونی میں کھڑا سوک پر ابھرتی ہوئی روشنیاں دیکھتا رہتا پھر فوزیہ کے کمرے میں جا کر اس کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا۔ اس کی شادو کے کپڑے اب تک کھونٹی پر لٹکے ہوئے تھے۔ وہ حسرت سے دیکھتا رہتا۔ کمرے میں کھٹکا ہوا۔ ناصر نے پلٹ کر دیکھا تو قمر تھا۔ "آؤ قمر"

غفور خوز فوزیہ کا بڑا خیال رکھتا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ فوزیہ برآمدے میں بیٹھی اپنا چٹا ہوا دوپٹہ سی رہی تھی۔ غفور کی بیوی کیس پر دوس میں مگنی ہوئی تھی۔ اسے پھرنے کی بڑی عادت تھی۔ ایک میلا سا سفید برقعہ ہمیشہ باہر رہی پر لٹکا رہتا۔ جس پر جگہ جگہ پان کی پیک نے پھول سے بنا دیے تھے۔ جیلہ بے چاری گھر کا کام کرتی رہتی یا پھر اپنے جینز کے لیے پھول بناتی رہتی۔ میز پوش پر۔ اگر زندہ دل تھی تو ٹھیک۔

اس نے باہر پھیری والے سے منگوا کر چھوٹے کھائے تھے اور اب اٹلی منگوانے کی فکر میں دروازے سے باہر جھانک رہی تھی۔ فوزیہ سوچتی رہتی کہ دنیا میں کتنے لوگ ہیں، ہر ایک مختلف کیس کچھ ہے اور کیس کچھ ہے اور اب اس چھوٹے سے گھر میں کتنے مختلف سے لوگ ہیں اور پھر اس لئے غفور بابا کو آتے دیکھ کر ٹھیکہ بھاگ آئی۔

”کیا بات ہے بھائی کیوں آ رہی ہو؟“

”وہ آیا آ رہے ہیں۔“

”ٹھیکہ اگر برآمدہ مانو تو ایک بات کوں۔“ فوزیہ نے کہا۔

”کتنے باہمی۔“

”تم پڑھنا شروع کر دو اور یہ دروازے گلی میں جھانکنا چھوڑ دو۔“ ٹھیکہ بھنے لگی۔ فوزیہ ابھی کچھ کتنا چاہتی تھی کہ غفور بابا رکشہ ٹھہرا کر اندر آ گئے۔

”فوزیہ بیٹی“

”جی فرمائیے“ وہ ہمیشہ بابا کی عزت کرتی تھی۔

”چلو بیٹی، تمہیں گھما لاؤں۔ بہت دنوں سے گھبرا گئی ہوگی۔“

”نہیں بابا آپ کو یہ خیال کیوں ہوا؟“

”نہیں چلو بیٹی جیلہ تم بھی چلو۔“

”ابا میں بھی چلوں گی۔“ ٹھیکہ سے رہا نہ گیا۔

”تمہیں نہیں جاسکتیں۔ دو جاسکتی ہیں، چاہے تم چلو چاہے وہ۔“

”ٹھیکہ جی چلی جائے بابا میں گھر رہوں گی۔“ جیلہ نے ہنس کر کہا۔

اور فوزیہ پیار سے جیلہ کو دیکھنے لگی۔ کتنی سنجیدہ لڑکی ہے یہ کتنی پیاری اور پھر فوزیہ نہ ٹال سکی۔

برقع پس کر دونوں رکشائیں جا بیٹھیں اور بابا بھی بیڑی لٹاکر رکشا اشارت کرنے لگا۔

رکشا سڑکوں پر گھومنے لگا۔

”کہاں چلوں بیٹی۔ بابا نے گردن موڑ کر پوچھا۔

”جہاں آپ کی مرضی“

”چلو آج جمعرات ہے کلفٹن چلتے ہیں مزار پر۔“

”چلو بابا“

کچھ دیر بعد کلفٹن کے گنبد نظر آنے لگے اور پھر رکشہ دائیں ہاتھ مڑ گیا۔

مزار پر بے حد رش تھا۔ کیس پر قوالی ہو رہی تھی۔ لوگ میڑھیوں پر ہار

لیے چڑھ رہے۔ بابا ان دونوں کو لے کر میڑھیاں چڑھنے لگا۔

مزار پر ایک طرف میلاد ہو رہا تھا۔ ایک طرف عورتیں گڑگڑا کر دعائیں

مانگ رہی تھیں۔

فوزیہ نے بھی اپنے خوبصورت ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور اس کے لب

کیکپائے۔ ایسے وقت میں بھی اس کی زبان ناصر کی خیریت کے لیے لرزے لگی۔

تو رتی محبت۔۔۔۔

”معبود۔ ناصر خوش رہے۔“

”یا اللہ۔ تو میری عمر بھی اسی کو دے۔“

”وہ سبھی رہے۔ خوش رہے۔“

عین اس وقت اس نے اکبر علی کو دوسری طرف گڑگڑاتے ہوئے دیکھا جو

آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ دعا مانگ رہا تھا۔

وہ لرز گئی۔ خدا خیر کرے۔

یہ رو کیوں رہے ہیں۔ انہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ میں ان کے سامنے

"بابی نے منع کر دیا۔"

"اچھا" وہ چپ سا ہو رہا تھا۔ جانتا تھا کہ شاید فوزیہ یہ نہ سمجھ جائے کہ وہ شک آگئے ہیں۔ رات کو جب وہ گھر آئے تو شکیلہ کی ماں کا ہاتھ چڑھا ہوا تھا۔  
 "کیوں گئی تھی تو؟" وہ شکیلہ پر برس پڑی۔  
 "یہ بچھن مجھے پسند نہیں۔ گھوٹے پھرنے والی لڑکیاں تو ماں باپ کی ناک کاٹ دیتی ہیں۔"

فوزیہ کا منہ سرخ ہو گیا۔ خلقِ خشک سا ہو گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔  
 "بالکل سوچ کر بات نہیں کرتی۔ تم انہیں کی ماں۔" غفور بابا نے بیوی کی بات کو محسوس کیا۔

"تم میرے منہ نہ لگنا۔" کریمین بوا تیز تھیں۔  
 "میں کتنا ہوں زبان کو لگام دو۔" غفور بابا کو غصہ آ گیا۔  
 "میں تو کہوں گی۔ میں اپنی بیٹی کو کہہ رہی ہوں تم کون ہوتے ہو دخل دینے والے۔ کل کو ناک کٹ جائے گی تو پتہ چل جائے گا۔"  
 فوزیہ کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ سسک پڑی۔  
 "تم کیوں جی میلا کرتی ہو بیٹی۔ یہ عورت کیا جانے۔"  
 "اے میں گنوار۔" کریمین نے سر پیٹ لیا اور غفور بابا کو جی اتار کر اسے پٹینے لگے۔

فوزیہ بیچ میں آ گئی۔  
 "بابا خدا کے لیے میرے لیے گھر میں لڑائی نہ ڈالے میں کہیں چلی جاؤں گی۔"  
 "ہاں خوش ہو جاؤ۔ تمہاری تو آرزو پوری ہو رہی ہے۔" کریمین فوزیہ کو برابر دے رہی تھی۔

"آپ خانا ہوں میں کہیں چلی جاؤں گی۔"  
 "نہیں بیٹی تم مجھے معاف کر دو۔" غفور بابا نے کہا۔  
 "بابا مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔"

سے نکل گئی۔ اب غم کس بات کا مگر ایک سنگدل انسان کا یوں گھڑانا۔ کہیں ناصر۔ نہیں نہیں خدا نہ کرے۔ میں کیا سوچنے لگی۔

اور اس نے دیکھا اکبر علی مزار پر پھول چڑھا کر واپس جا رہے تھے۔ وہ پیچھے بھاگی۔ شکیلہ بھی اس کے پیچھے بھاگی۔

"بابی بابی" اکبر علی جوتوں کے تھے ہاندھ رہے تھے۔ تب اس کی نظر نیچے کھڑے ناصر پر پڑی جو نعمانہ کو گود میں لیے باپ کا انتظار کر رہا تھا۔  
 وہ ٹھٹھکی سی گئی۔ الٹی تیرا شکر ناصر خیریت سے ہے۔"

اے خوش بختی جو نعمانہ ان کی گود میں ہے۔ نعمانہ کی موجودگی میں یہ بات واضح ہوئی کہ نہرین موجود ہے اور وہ دل سوس کر رہ گئی اور میڑھیوں کے پاس دروازے کی اوٹ سے ناصر کو دیکھتی رہی۔ ناصر کتنا بدل گیا ہے۔ کچھ بیمار سے معلوم ہوتے ہیں

"بابی وہ کون ہیں؟" شکیلہ جو حیرت سے فوزیہ کے بدلتے ہوئے چہرے کی رنگت کو دیکھ رہی تھی۔ سوچنے لگی۔

"وہ۔ وہ۔ ناصر ہیں۔ میرے شوہر"

"آپ کے شوہر؟ تو پتلے پھر ان کے پاس چلتے ہیں۔ وہ تو جا رہے ہیں۔"  
 شکیلہ ناصر کو نیکی اشارت کرتے دیکھ کر میڑھیوں کی طرف پلکی۔

"نہیں نہیں شکیلہ رہنے دو۔ میں اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتی۔"

"بابی" موٹر شارٹ ہو کر سڑکوں پر بھاگنے لگی اور اس کا پیلا چھت اب بھی اسے نظر آ رہا تھا اور پھر نیکی سے اوجھل ہو گئی۔ تو وہ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر ہتھ کی نقاب میں جذب ہو گئے۔

"بیٹی کہاں ہو تم۔ میں کتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"پلو بابا" اور پھر وہ بابا کے ساتھ گھر آ گئیں۔ بابا نے انہیں گول گپے

کھلائے۔ وہ ان کا ساتھ دیتی رہی لیکن دل ڈوب سا رہا تھا۔

"بابی کے شوہر بھی وہاں آئے تھے بابا" شکیلہ نے بابا کو بتایا۔

"اچھا" مجھے کیوں نہ بتایا۔" وہ چونک گیا۔

"لیکن میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔"

اور وہ رات فوزیہ کو شاید ساری عمر یاد رہے گی۔ وہ پچکے سے انھی برقعہ اوڑھا اور چنٹی کھول کر باہر نکل آئی۔ رات چاندنی تھی۔ ہرچیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ وہ لگیوں سے نکلتی ہوئی سڑک پر آگئی۔

اس کا دماغ کچھ کام نہ کر رہا تھا کہ کہاں جائے۔ کیا کرے لیکن جہاں سڑک جا رہی تھی۔ وہیں اس کے قدم جا رہے تھے۔ سڑک پر روشنی سی ابھری۔ تو وہ ناریل کے درخت کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ روشنی کار کی تھی۔ کار گزر گئی تو وہ پھر سڑک پر چلتے گئی۔

نہ کوئی منزل

نہ کوئی ساقی

نہ کوئی راستہ

کانی دیر چلتے ہوئے گزر گئی۔ وہ پہچان نہ سکی کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ اب اس کے دل میں ایک اور ہی جذبہ اٹھا۔

کیوں نہ ہو۔ زندگی ختم کر دے۔ یہ زندگی کس مصرف کی۔ عزت سے مرجانا ہی اچھا ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ میری عزت لٹ جائے۔ نہیں نہیں مجھے مرجانا چاہیے اور پھر اس کی نظرس دور دور بھٹکتی نکلیں۔ دور اسے ایک سرخ بتی نظر آئی۔ بتیاں کچھ کچھ فاصلے پر تھیں۔ وہ سمجھ گئی یہ ریلے لائن ہے۔

وہ سڑک چھوڑ کر کچے سے راستے پر بھاگنے لگی۔ جگہ جگہ کانٹے اس کے پودن زخمی کر رہے تھے اور پھر دوسری جانب سے ایک تیز روشنی اس پر پڑی اور تیز بھاگنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ روشنی برابر اس پر پڑ رہی ہے۔ روشنی ایک فونی جپ کی ہے۔

پاؤں ہوئی وہ لائن کی جانب بھاگ رہی تھی اور اسی لمحے ایک گڑگڑاہٹ سی ہوئی۔ شاید زمین آ رہی تھی۔ دور روشنی بھی ایک نقطے کی مانند نظر آنے لگی۔ خدا جانتا ہے کہ مجھے اس وقت مرجانا ہی چاہیے۔

میں کیوں مر رہی ہوں۔ جپ کی روشنی قریب آ رہی تھی۔

اور جپ سے نکل کر ایک آدمی فوزیہ کے پیچھے بھاگنے لگا۔

فوزیہ لائن تک پہنچ گئی۔ اور اب وہ پنزری پر بھاگ رہی تھی لائن پر روشنی رینگ رینگ کر جوان ہو رہی تھی۔

مقابلہ کرنے والا بھی کچھ فاصلے پر رہ گیا تھا۔ اور آخر اس نے عین اسی لمحے جبکہ گاڑی کچھ فاصلے پر تھی۔ فوزیہ کو جالیا اور اچھل کر لائن سے باہر نکل آیا۔ فوزیہ اس کی ہانوں میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

اندھیرے میں اس کا سفید رنگ چمک رہا تھا۔ گاڑی ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ گزر گئی اور اپنی جو خالی وردی میں بیٹوس تھا۔ فوزیہ کو اٹھا کر جپ میں لے گیا۔ "چلو ڈرائیور جلدی کرو۔"

"اچھا صاحب۔ کیا گھر چلوں؟" ڈرائیور جپ کو سڑک پر لاتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں۔ گھر واپس چلو۔ میں آج دورے پر نہیں جا سکا ہوں۔"

ابنی جو ایک فوجی افسر تھا اور جس کا نام اختر تھا۔ فورے فوزیہ کے حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کی منہ پر تھا کہ یہ حسین سی لڑکی کیوں خودکشی کر رہی ہے۔

جپ ایک پتنگے میں داخل ہوئی تو چوکیدار بھاگا آیا۔

"واپس آگئے سرکار۔"

"ہاں بابا۔ تم ڈاکٹر کو فون کرو ڈرائیور۔ اسی وقت آجائے۔"

اختر فوزیہ کو اندر لے گیا اور اپنے پتنگ پر لٹا دیا۔

مقابلہ فوزیہ کے چہرے سے ہٹ چکا تھا اور سمور کر دیئے والے حسن نے اختر کو ایک لمحے کے لیے ساکت کر دیا۔

وہ بے چینی سے ٹپٹے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ لڑکی کا برقع اتار دے لیکن اس کی شرافت نے اجازت نہ دی۔ بلکہ اس نے ایک کھیل فوزیہ کو اڑھا دیا۔ کچھ دیر بعد اس کا دوست ڈاکٹر محمود بھی آیا۔

فوزیہ کو دیکھ کر وہ بھی سکتے میں آگیا۔ "اختر یہ کون ہے یار"



رات کو ہی اختر نے چوکیدار کی بیوی کو فوزیہ کے پاس بھیج دیا تھا اور خود اپنے کمرے میں پریشان رہا اور اس رات فوزیہ پر واضح ہو گیا کہ وہ ایک شریف انسان کے گھر میں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ایک غیر مرد تھا۔

صبح اختر فوزیہ کے پاس مزاج پر سی کے لیے آیا تو فوزیہ نے آہستہ سے کہا۔

”بھائی جان۔ آپ خواہ مخواہ میرے لیے اتنا پریشان ہوئے۔“

بھائی کے لفظ سے اختر لرز سا گیا۔ اور پھر وہ اس شیریں لہجے سے متاثر ہو کر وہ فوزیہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ۔ آپ“ اور آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

فوزیہ بات سمجھ گئی اور آہستہ سے کہنے لگی۔ ”کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“

”اب میں اچھی ہوں۔ آج ہی کیس جلی جاؤں گی۔“ فوزیہ نے فیصلہ کر دیا۔

”نہیں نہیں میں آپ کو کیس نہیں جانے دوں گا۔“ کہیں پھر۔“

”میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔ آپ کی بیوی۔“

”میری بیوی لاہور ہے۔ ان کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔ اسی لیے۔“

اختر نے بات کھول دی۔

”لیکن مجھے تو جانا ہی چاہیے۔“ وہ رکتے رکتے کہنے لگی۔

”دیکھئے آپ نے مجھے بھائی کہا ہے اور اس مقدس رشتے کی لان رکھئے۔“

”تم پہلے اسے ہوش میں تو لاؤ۔“

اور محمود اس کی نبض دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کوئی چیز نکال کر فوزیہ کو سٹکھائی اور انجکشن دیا۔

فوزیہ نے فوراً ”آئینہ کھولیں تو دونوں دوستوں پر ایک بجلی سی مگری۔“

”میں کہاں ہوں۔ میں کہاں ہوں۔“ وہ حافظہ پر زور دینے لگی۔ اور پھر وہ اجنبی صورت دیکھ کر گھبرا گئی۔ ”آپ کون ہیں۔ اور میں“

”آپ فکر نہ کیجئے ہم شریف لوگ ہیں۔ جب آپ ٹھیک ہو جائیں گی تو جہاں کہیں گی آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔“

”اوہ“ فوزیہ چبئی۔ ”تو آپ ہیں مجھے بچانے والے۔ آپ نے کیوں بچایا مجھے۔ مرنے دیا ہوتا۔“ وہ رو پڑی۔

”آپ کمزور ہیں۔ رو کر اپنے آپ کو ہلکان نہ کیجئے۔“

”کیا یہاں کوئی عورت نہیں۔“ فوزیہ کو ایک اور احساس ہوا۔

”جی نہیں، مگر آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کی عزت ہمیں عزیز۔“

لیکن فوزیہ کچھ سہم سی گئی اور کھل میں منہ چھپا کر کہنے لگی۔

دوسرے دن حامد کی شادی تھی۔ فوزیہ کو حامد ایک آنکھ اچھا نہ لگا اویاش سا خواہ مخواہ گھورنے لگا اور فوزیہ کو تو وہ یوں گھورتا تھا کہ فوزیہ کو نفرت ہو گئی۔ اختر نے فوزیہ کا مختصر حال ثریا کو بتایا تھا۔  
حالا کہ اپنے حالات فوزیہ جہاز میں اختر کو سنا چکی تھی۔

دوپہر کو وہ کاروں میں بیٹھ کر دلہن کے گھر آئے۔ ثریا نے بتایا کہ اس کی ہونے والی بھابی ایک خاوند سے طلاق لے چکی ہے۔  
ماں باپ حج کو جا چکے ہیں اور وہ خود مختار ہے۔  
موٹریں ایک خوبصورت سے بنگلے میں جا کر رکھیں۔

"یہ او۔ دلہن تو خود استقبال کے لیے کھڑی ہیں۔" اختر نے زور سے کہا اور ساتھ ہی فوزیہ نے دلہن کی طرف دیکھا تو بھونچکی رہ گئی۔  
"یہ دلہن یعنی نسرین۔" وہ حیرت کے مارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"میری بہن یوں کیوں کھڑی ہے۔" اختر نے اسے دیکھ لیا۔

"میں تو یہ" وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے لگی۔

اتنے میں نسرین ان کے قریب آ گئی۔ ثریا سے مل کر وہ اختر سے باتیں کرنے لگی۔ فوزیہ منہ پھیرے کھڑی تھی۔ "یہ کون ہیں؟" نسرین نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"یہ میری بہن۔" اور جب فوزیہ نے گردن نسرین کی طرف موڑی تو وہ چیخ اٹھی۔

"تم فوزیہ۔"

"کیا۔ کیا تم انہیں جانتی ہو۔" ثریا اور اختر ایک ساتھ بولے۔

"یہ۔ ہاں ہاں میں انہیں جانتی ہوں۔ یہ ناصر کی دوسری بیوی۔"

"ناصر کی دوسری بیوی۔ یعنی تمہارے شوہر۔"

نہ جانے کس طرح اختر کہہ بیٹھا۔

"اوہ" بھیا۔" فوزیہ کے چہرے پر ہچک سی آگئی اور اختر نے واقعی اپنے دل میں ایک نیا پیار محسوس کیا۔ اس کی کوئی بہن نہ تھی اور بے اختیار ہی فوزیہ کے سر پر ہاتھ رکھ بیٹھا۔ فوزیہ کی آنکھیں چمک آئیں اور ساتھ اختر کی بھی۔  
"میری بہن کا نام کیا ہے۔" اس کے دل میں سچا غلوں ابھرا۔

"فوزیہ۔"

"اور میرے بھیا کا۔" فوزیہ نے پوچھا۔

"اختر۔"

"اچھا تو۔ فوزیہ۔ میں ثریا کے بھائی کی شادی پر جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو گی

"؟"

"میں بھائی جان۔ میں یہیں رہوں گی۔"

"میں۔ میں ایسی خطرناک اراووں والی بہن کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔

میں نہیں جاتا شادی پر۔ ثریا ہی ناراض ہوگی ہونے دو۔"

"اچھا تو پھر میں بھی چلوں گی۔"

اختر خوش ہو گیا۔ "میں سیٹ بک کرا لوں۔"

"آپ کی مرضی۔"

اور پھر اختر بی۔ آئی۔ آئے سے بنگلے آفس فون کرنے لگا اور شام کو وہ

فوزیہ کو لے کر لاہور چلا گیا۔

ثریا ایئر پورٹ پر۔ وہ دو تھی۔ ساتھ حامد بھی ثریا کا بھائی۔

اپنے خاوند کے ساتھ لڑکی دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہوئی لیکن اختر نے جلد

ی اس کا شک دفع کر دیا۔

"ثریا یہ میری بہن بولی بہن فوزیہ۔ تسلیل بعد میں" تب ثریا بھی فوزیہ سے

ملی اور غلوں سے ٹکسی میں بیٹھ کر وہ شہر کی طرف مڑنے لگے۔

ثریا فوزیہ سے باتیں کرتی رہی اور اختر حامد کو چھینتا رہا۔

حامد بھائی "فوزیہ جینی۔

"تم بہت خوبصورت ہو۔ دنیا کی سب عورتوں سے زیادہ۔ ہا۔ ہا۔" حامد آگے بڑھا۔

اور فوزیہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔

"شور مت مچاؤ۔ آؤ تو میں تمہیں دیکھ کر دیوانہ سا ہو گیا تھا۔"

فوزیہ کی چیخ پورے کمرے میں پھیل گئی اور ساتھ ہی ہنسنے لگی اس کمرے میں چل گئی۔ جہاں اختر ثریا سے باتیں کر رہا تھا۔

وہ دونوں گھبرا کر فوزیہ کے کمرے کی طرف بھاگے۔ دروازہ بند تھا۔ حامد کے قہقہے اور فوزیہ کی جھینجھیں ابھر رہی تھیں۔

"اختر بھائی اختر"

"حامد دروازہ کھولا۔" اختر کی غصے میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"دروازہ نہیں کھلے گا۔ اور پھر ثریا غسل خانے کی کھڑکی سے اندر کی جانب بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔

اختر نے کمروں کی بارش کر دی۔ گھونے کے پھننے لگے۔

ثریا بھائی کو کوس رہی تھی اور فوزیہ منہ پھپھانے لگی تھی۔

ثریا نے اسے گلے لگا لیا۔ عین اسی لمحے نرسن کمرے میں داخل ہوئی اور حامد کا یہ روپ دیکھ کر وہ بھی برس پڑی۔

"ذلیل، کینے۔"

"تم ذلیل تم کہیں۔" حامد کو بھی کچھ ہوش آیا۔

"خدا کا شکر ہے میری بہن کی عزت بچ گئی۔" اختر فوزیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا اور نرسن تو دیوانوں کی طرح حامد کا گریبان کھینچنے لگی۔

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" حامد برابر کہہ رہا تھا۔

اور پھر اسی جھگڑے میں آدھی رات گزر گئی۔ بڑی مشکل سے نرسن اپنے کمرے میں گئی اور وہاں جا کر اسے ناصرا یاد آگیا۔ میری سزا۔ ساتھ ہی اسے نغمانہ یاد آگئی۔ "آہ" میں نے کتنی بڑی غلطی کی اور اس تہذیب کا انجام۔ یہ آج

"ہاں سابقہ شوہر۔" نرسن کے اس فقرے پر فوزیہ پانی پانی ہو گئی اور اختر نے بھی بیوس بیوس کیڑ لیں۔

فوزیہ کے دل کی حالت اس وقت عجیب ہو رہی تھی۔ تو اس نے طلاق لے لی۔ سچ ہی تو ہے اس عورت نے واقعی ناصری زندگی تیار کر دی ہوگی۔ "آہ" ناصر میں آ رہی ہوں۔ میں آ رہی ہوں۔ سارے وعدے توڑ کر۔ اور دوسرے لمحے اختر اور ثریا اسے ہال میں لے گئے اور وہ اس ماؤرن شادی میں کچھ بوری ہو گئی لیکن وہ اس شادی کے دوران ناصری یاد میں کھوئی ہوئی تھی۔

☆☆☆☆

شادی گزر گئی۔ حامد اور نرسن لندن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ثریا اور اختر بھی معد فوزیہ کے واپسی کی فکر میں تھے۔

فوزیہ تو بے حد بے چین تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر کراچی چلی جائے۔ نہ جانے ناصر کا کیا حال ہوگا۔

اور اس رات ایک بڑا ہی عجیب واقعہ ہوا جس کا کسی کو گمان نہ تھا۔

فوزیہ اسی کمرے میں لیٹی تھی۔ ثریا اور اختر بھی اپنے کمرے میں تھے۔ حامد نرسن کے ساتھ پکڑ گیا تھا۔ فوزیہ کو نیند نہ آ رہی تھی۔ آہستہ کن کر چوکی۔ سامنے دیکھا تو حامد شراب میں دھت کھڑا تھا۔

"آپ۔ حامد بھائی۔" فوزیہ کی زبان لڑکھڑاسی گئی۔

"درو نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔" نائے کی وجہ سے اس کی زبان لڑکھڑاسی رہی تھی۔

"حامد بھائی خدا کے لیے پتہ پائے۔ وہ نرسن۔" فوزیہ گھبراہٹ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نرسن کلب جاتی ہے، وہ نہیں آئیں گی۔ تم فکر نہ کرو وارننگ" حامد ڈنگاتے قدموں سے فوزیہ کی جانب بڑھا۔

دیکھ لیا۔

صبح حامد نے نرسن کو طلاق دے دی اور خود لندن روانہ ہو گیا۔ نرسن کی حالت بری تھی۔ اس نے فوزیہ سے گزارش کر معافی مانگی اور اپنی اور ناصر کی زندگی کے حالات رو رو کر سنائے اور آخر میں نغمہ کو پالنے کی منت کی۔ اور نرسن اسی رات اپنے والدین کے ہاں چلی گئی جو ج سے واپس آ گئے تھے۔

فوزیہ، ثریا اور اختر کے ساتھ کراچی چلی آئی۔

ناصر کی زندگی پھر اسی دور ہے پر آکھڑی ہوئی اور ان دنوں تو اس کی حالت دیوانوں جیسی تھی۔ کپڑوں کا بوش نہ تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی اور دفتر میں جہاں بیٹھا وہیں شام کر دی۔ قمر نے اسے بار بار سمجھایا لیکن اس پر پیسے اثر نہ ہوتا تھا۔ اب تو نغمہ کو بھی پیار کرتا چھوڑ دیا تھا۔ اکبر علی نے اسے سمجھانا چھوڑ کر دعا کرتا شروع کر دی تھی۔ وہ ہر جگہ جاتے فوزیہ کو تلاش کرتے۔ اکثر رات کو ایک دو بجے گھر آتے۔ کراچی کا کونہ کونہ چھان مارا تھا اور پھر ایک دن وہ رکشے میں بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے کہ پکرا کر رکشے میں ہی پڑے۔ رکشے والے نے سنبھالا اور پھر اکبر علی نے بشکل گھر کا پتہ بتایا۔ رکشا والا اوپر پہنچانے آیا۔ گھر میں صرف رقیہ تھی۔

”آپ کو فوزیہ کی تلاش نے اس حال تک پہنچا دیا۔ نہ جانے کہاں چلی گئی۔“ اور فوزیہ کے لفظ سے رکشا والا چونک اٹھا۔ ”فوزیہ؟“

اکبر علی کو جھک پر لٹا کر اس نے پوچھا۔

”یہ میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کس فوزیہ کی تلاش ہے؟“

”یا آپ کو بھی کسی فوزیہ کا علم ہے۔“ اکبر علی چونک پڑے۔

”کوئی ایک مہینہ پہلے ہی اس محلے سے ایک سواری لے گیا تھا۔ برقعے میں لپیٹا ہوا لڑکی۔“

”ہاں، ہاں وہی۔ کہاں ہے وہ۔“ رقیہ اور اکبر علی ایک ساتھ بولے۔

”وہ میرے پاس تھی۔ میں اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔“ اور غفور بابا نے

پورے حالات سنا دیے۔

”اب وہ کہاں ہے۔“ اکبر علی بے تاب تھے۔

”اب وہ نہ جانے کہاں چلی گئی۔“ غفور کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

”اوہ، اب کیا ہو گا۔“ رقیہ پریشان ہو گئی۔

”میں نے خود اسے برا تلاش کیا لیکن میری بیوی کی باتوں سے شک آ کر کہیں چلی گئی۔“ غفور شرمندگی سے بولا۔ اتنے میں قمر گھبرایا آیا۔

”چا جان، چچا جان جلدی چلے۔“

”کہاں، کیا بات ہے۔“ نیریت ہے۔ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟“ اکبر علی ایک سانس میں کئی سوال کر گئے۔

”وہ ناصر زخمی ہو گیا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔“

”ہیں۔“ اکبر علی ایک دھکے کے ساتھ گر پڑے۔ رقیہ دوڑی ہوئی کوراسین اٹھلائی۔ بڑی مشکل سے اکبر علی کی حالت سمجھ لی اور وہ سب ٹیکسی میں ہسپتال آئے۔ جہاں ناصر موت اور زندگی کی کشمکش میں جلا تھا۔ چہرے پر زردی نکری ہوئی تھی۔ اکبر علی سے بیٹے کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی اور رقیہ کی آنکھوں کے سوتے پھوٹ نکلے۔ قمر گھبراہٹ میں ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ غفور بابا ان کے ساتھ تھا۔ وہ دھکے مگر گئے۔ ڈاکٹر اپنی تدبیریں لڑا رہے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ ناصر اپنی جوتی حالت میں دفتر سے نکلا۔ اور اپنے ہی خیالوں میں کھویا چارہا تھا کہ ایک جانب سے بس نکلی اور دوسری جانب سے ٹیکسی، وہ ان دونوں میں گھر کر رہ گیا اور پھر ایک دھماکہ ہوا اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ قمر کو کسی نے دفتر میں اطلاع دی تو وہ بھاگا اور پھر مسلسل چار گھنٹے موت اور زندگی کی کشمکش کے بعد زندگی کی امید ہوئی۔ ڈریسنگ تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ چونٹیں کئی جگہ آئی تھیں۔ بازو کی ہڈی کو بھی ضرب پہنچی تھی اور خون کافی نکل چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے کافی مقدار میں خون ناصر کو پہنچایا اس کے دونوں بازوؤں میں خون کی بوتلیں لگی ہوئی تھیں۔ جسم میں خون پہنچ رہا تھا اور زندگی لوٹ رہی تھی۔ پڑمرودہ چہرہ پر رونق آنے لگی۔ اکبر علی کی دعا سنائی گئی۔



”ارے اندر چلے۔“ رقیہ نے انہیں دیکھ کر کہا۔

”چچا جان یہ ہیں میرے بھائی جان اور بھابی جان جو شاید مجھے نہ پہچانتے تو آج۔“

”اوہو۔“ وہ سب ڈرانگ روم میں بیٹھ گئے۔

اختر نے فوزیہ کی خود کشی کا حال اکبر علی کو بتایا۔

”چلے اب ہسپتال چلیں۔“ ثریا فوزیہ کی بے تابی بھانپ گئی۔ جو نغمہ ان کو گود میں اٹھائے بیاد کر رہی تھی۔

”ابھی چلتے ہیں۔“ اکبر علی نے جواب دیا۔ رقیہ چائے لے آئی۔ سب چائے پینے لگے۔

اختر نے پوچھا۔ ”اب کیا حالت ہے ناصر کی؟“

”اب تو ٹھیک ہیں۔ باتیں کرتے ہیں لیکن اٹھ نہیں سکتے۔ کل اور پرسوں بری حالت تھی۔“

اکبر علی نے بتایا کہ ناصر دیوانہ سا ہو رہا تھا اور ایکسیڈنٹ بھی دیا گئی کا باعث تھا۔ ثریا شراوت سے فوزیہ کو دیکھتی رہی۔ وہ جھنجپ رہی تھی کچھ دیر بعد سب اسپتال چلے آئے۔ کمرے میں ناصر بیٹھا قرسے یا تیل کر رہا تھا۔ طے یہ پایا کہ فوزیہ فی الحال باہر رہے کہ اچانک ناصر اٹھ نہ بیٹھے اور زخم وغیرہ پر کچھ اثر نہ ہو۔

چنانچہ فوزیہ باہر برآمدے میں بیٹھی رہی اور باقی سب ناصر کے پاس اندر گئے۔ قمرود آتا ہوا باہر آیا اور فوزیہ کو ملامت کرنے لگا۔

”توبہ بھابی آپ تو بہت ہی بے مروت ہیں۔“

”کیوں بھیا میں نے کیا ہے مروت کی ہے۔“ فوزیہ مسکرا کر بولی۔

”ہمارے ناصر بھیا تو آپ کے جہر میں جان دے بیٹھے تھے۔“

”خدا نہ کرے۔“

”توبہ یہ بے حیائی ہم نے کہیں نہیں دیکھی جھٹ سے کہہ دیا خدا نہ کرے۔“

کراچی پہنچے ہی اختر ناصر کے دفتر پہنچا۔ جہاں فوزیہ نے بتایا لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ناصر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ پریشانی میں گھر پہنچا تو فوزیہ مجسمہ انتظار بنی ہوئی تھی۔ اختر کو پریشان دیکھ کر وہ کانپ سی گئی۔

”کیوں بھیا خیریت ہے نا۔“ وہ تقریباً روتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں اچھی خبر نہیں لایا۔“ اختر نے سر جھکا لیا۔

”کیا بات ہے بتائیے نا۔“ ثریا بھی پریشان ہو گئی۔

اور فوزیہ آگے کچھ بھی نہ سن سکی۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر وہ سچ اٹھی۔

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اختر اور ثریا اسے سنبھالنے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی موٹر میں بیٹھ کر فوزیہ کے بتائے ہوئے پتے پر چلے گئے۔ گاڑی فلیٹ پر رکی تو فوزیہ لڑکھاتی ہوئی بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اختر اور ثریا بھی ساتھ تھے۔ دروازہ کھلا تھا لیکن فلیٹ پر ایک خطرناک سے خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ برآمدے میں نغمہ نے آ کر ایللی ہوئی تھی۔

فوزیہ کو دیکھ کر وہ بھائی۔ آپ۔“

”ہاں وہ سب کہاں ہیں۔“ فوزیہ بیٹھی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

”وہ سب ہسپتال میں۔“ اور اسی لمحے بیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز

آئی فوزیہ نے دیکھا۔ اکبر علی اور رقیہ تھے۔ وہ دونوں فوزیہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

رقیہ دوڑ کر فوزیہ سے پٹ گئی اور اکبر علی نے بھی فوزیہ کو سینے سے لگا لیا۔

”میری بیٹی میں نے تمہیں کتنا تلاش کیا۔ بیٹی خدا نے تمہارا سناگ بچا لیا۔

بڑا احسان کیا اس نے۔“ اور فوزیہ کی کلی کھل گئی اور آنسوؤں کے درمیان وہ مسکرا دی۔ اختر اور ثریا کھڑے ان کا ملایپ دیکھتے رہے۔

فوزیہ مسکرائے گی۔ اندر اکبر علی نے آہستہ سے ناصر کو فوزیہ کے ملنے کا بتایا اختر اور ثریا کا بھی تعارف کرایا۔

ناصر کے زرد چرے پر چمک آگئی۔ رقیہ کو دیکھ کر وہ بے وجہ ہنس دیا۔ کافی دیر تک اختر اور ثریا بیٹھے رہے اور پھر دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اکبر علی اور رقیہ بھی واپس چلے گئے۔ فوزیہ اب تک برآمدے میں بیٹھی تھی۔ قمر اندر ناصر کے ساتھ لگا تھا۔ "مبارک ہو ناصر" "کس بات کی؟" ناصر بے وجہ ہنس رہا تھا۔ "نیکم صاحبہ آگئیں۔" فوزیہ بھی پردے کے پیچھے باتیں سن کر مسکرا رہی تھی۔

"وہ مجھے دیکھتے کیوں نہیں آئیں۔" آخر ناصر نے کہہ ہی دیا۔

"ارے میاں ذرا صبر کرو۔ تم تو بالکل ندیدے ہو۔"

"اس وقت وہ کہاں ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"اپنے گھر۔"

"اچھا۔" ناصر بھگہ سا گیا۔

"ناصر میں ذرا باہر جاؤں۔" قر نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"یار ذرا نرسوں سے گپ شپ لڑاؤں۔" قر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"اب بتاؤ ندیدے تم ہو۔"

"نہیں یار یہاں نرسیں کچھ اچھی ہیں۔ باتیں خوب مزے کی کرتی ہیں

جاؤں پھر؟"

"بھائی سے کہوں گا۔" ناصر نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں یار بھائی تمہاری اپنی جگہ اسے کون مل سکتا ہے۔ لیکن وہ ذرا کیا

کہتے ہیں۔ دل پشوری کروں گا۔"

ناصر ہنسنے لگا اور قمر باہر فوزیہ سے آکر کہنے لگا۔ "اب اندر بھی جاؤ گی یا

میں لے جاؤں۔"

"نہیں، نہیں میں بھلا اندر کیوں جاؤں۔" فوزیہ شرما گئی۔

"اچھا مجھ سے شرما تی ہو۔ میں چلا۔"

قر کے جانے کے بعد فوزیہ آہستہ سے دروازہ کھول کر جھانکنے لگی۔ ناصر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور ناصر کے سر ہانے کھڑی ہو گئی۔ اس کا زرد چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پتھک آئیں اور گرم گرم آنسو ناصر کے ماتھے پر گرے۔ وہ جان گیا مگر اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ اگلے لمحے فوزیہ نے اس کی پیشانی پر اپنے گال رکھ دیے۔ ناصر نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور اس کے بالوں کو ہتھپتھپانے لگا۔ فوزیہ ناصر کے سینے پر سر رکھ کر سبک پڑی۔

"ہوں، پگنی روتی کیوں ہو۔" وہ مسکرایا۔

"میں بہت گھٹکار ہوں۔ میں بہت بری ہوں۔ میری وجہ سے تمہاری یہ حالت ہوئی۔" جذبات میں بہہ گئی اور ناصر اس کے آنسو ہاتھوں سے صاف کرنے لگا۔ "فوزیہ میری اپنی فوزیہ"

اور میں ان لمحے قمر زور سے کھانا۔ فوزیہ ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میاں ناصر تم بیمار ہو۔ کچھ اپنی بیماری کا خیال رکھو۔"

"تم کباب میں ہڈی کیوں ہنستے ہو۔" ناصر نے کہا۔

اور فوزیہ شرم سے دھری ہو گئی۔

"بھئی، مجھے تمہاری صحت کا زیادہ خیال ہے۔ اے محترمہ آپ براہ کرم گھر

رہا کریں۔" قر نے فوزیہ کی طرف گھورا۔

"نہیں رہوں گی، آپ کو مطلب۔" فوزیہ کو نہ جانے کیسے یہ جملہ کہنے کی ت ہوئی۔

ناصر پیار سے اسے دیکھنے لگا۔

"قمر تمہیں وہ مس مری بلا رہی ہیں۔" ناصر نے یونہی کہہ دیا۔

"اچھا بھئی، تم نہیں مانتے میں چلا۔" فوزیہ اور ناصر ہنسنے لگے۔

وقت نامرہنے لگا۔ قمر نے رقیہ کی چوٹی پکڑ لی۔ ”کمال کرتی ہو۔ اس طرح مت بھاگا کرو۔“

”فوزیہ بڑ گئی۔“ فوزیہ تم بہت ہی خراب ہو۔“  
 ”قمر بھائی بڑے کچے ہیں۔ کیا بوڑھوں کی طرح نہیں کر رہے ہیں۔“  
 ”بے بی صبح بات تو کہتا ہوں۔ اچھل اچھل کرنا ہو بیٹیوں کو زیب دیتا ہے۔“

سب ہی ہنس رہے تھے۔ آیا نغمہ کو شلا کر لے آئی اور فوزیہ اسے کپڑے پہنانے لگی۔ قمر مسکرا کر رقیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اکبر علی بھی آگے اور چائے کا انتظام کروانے کی باتیں کرنے لگے۔ شام تک گھمسی رہی اور پھر شام کو مہمان آئے لگے۔ اکبر علی ڈرائنگ روم میں مہمانوں کو بٹھانے لگے۔ عورتیں کم ہی تھیں۔ جیلہ، نگیلہ مہمانوں کے خاطر میں معروف تھیں۔

فوزیہ آفتیش رنگ کے سوٹ میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ ایک شعلہ ادھر ادھر گھومتا نظر آ رہا تھا اور دلی خوشی کے جذبات کا چہرے سے پتہ چل رہا تھا۔

ثریا اور اختر بھی آن پہنچے۔ اختر، فوزیہ اور ناصر کے لیے تحائف لایا تھا۔ فوزیہ ہنس ہنس کر ثریا کی باتوں کا جواب دے رہی تھی اور رات تک خوب دھوم دھام رہی۔ شام کو مہمان رخصت ہو گئے اور پھر ایک بات یہ ہوئی کہ نغمہ کو بڑا تیز بخار چڑھ آیا۔

فوزیہ یہ سب کچھ بھول گئی۔ ڈاکٹر آیا دوا دے کر چلا گیا لیکن بخار بہت تیز تھا۔ فوزیہ بے حد پریشان تھی۔ یوں تو سارا گھر پریشان تھا۔ لیکن فوزیہ ان سب سے کچھ علیحدہ تھی۔ ناصر نے کئی بار کہا کہ وہ آرام کرے لیکن فوزیہ نغمہ کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ رات نامر کی جب بھی آنکھ کھلی فوزیہ کو میٹھے پایا۔ کبھی وہ نمبر پڑھ لے رہی تھی اور کبھی دوا دے رہی تھی۔ ناصر کا دل اس کی محبت سے منور ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ واقعی عورت کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ یہ واقعی ایک عمدہ ہے۔ ”فوزیہ“ صبح کے چار بجے ناصر نے بھرا سے پکارا۔

آج ناصر ہسپتال سے آگیا تھا اور اکبر علی نے غسل صحت کے لیے ایک تقریب منعقد کی تھی۔ اس میں ناصر کے دفتر کے کئی افسر تھے۔ چچا اسلام مدد چچی اور اپنے اہل و عیال آئے تھے۔ غفور مدد اپنی بیوی اور لڑکیوں کے آیا تھا۔ وہ سب بڑے خوش تھے۔

رقیہ غراہہ سنبھاتی ہوئی ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھی اور آج غضب نہ ہوا تھا کہ فوزیہ نے ایک خبر قمر کو سنا دی اور رقیہ کی تو شامت آگئی۔ صبح ہی سے نکیلہ اور جیلہ آنکلی اور فوزیہ شرارت سے مسکرانے لگی۔ ”رقیہ تم بس آپ۔“

وہ کچھ جھلا سی گئی۔

”یہ تم مسکرا کیوں رہی ہو ہماری بیگم کو دیکھ کر“ قمر نہ رہ سکا۔

”بس میری مرضی۔“

”اور کیوں جی تم بھی ہنس رہی ہو ایک نامحرم لڑکی سے۔“ قمر نے رقیہ کو ڈانٹ کر کہا۔

”بات کیا ہے آخر۔“

”قمر بھائی سے میٹھا کھائے۔“ فوزیہ آہستہ سے کہنے لگی۔

”وہ کیوں؟“ ناصر نے پوچھا۔

”فوزیہ میں مار بیٹھوں گی۔“ رقیہ نے گھور کر فوزیہ کو دیکھا۔

”ہوں تو یقیناً کوئی بات ہے۔“ قمر ہنس کر کہنے لگا۔

”مجھے بھی بتاؤ نا۔“ ناصر بے تاب ہو گیا۔

”وہ۔“ فوزیہ خود کہتے ہوئے شرما رہی تھی۔

”بھئی بات بتاؤ۔ میرا دل ہول رہا ہے۔“ قمر نے روٹی آواز سے کہا۔

”قمر بھیا آپ۔ ابا جان بننے والے ہیں۔“ فوزیہ نے چپٹے ہوئے کہا اور رقیہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔ اس کا منہ سرخ ہو گیا اور قمر کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ اس

”فرمائیے۔“

”یہاں آکر لیٹ جاؤ کچھ دیر۔“

”نہیں“ وہ شرما سی گئی۔

”کچھ تو آرام کرو۔“ ناصر بھند تھا۔

”آپ آرام کیجئے۔ اب بخار بہت کم ہے بالکل اتر رہا ہے۔“

”تو پھر تم آرام کرو۔“

آپ سوئیں۔ میں یہاں نعمانہ کے پاس لیٹ جاتی ہوں۔“

اور اگلے لمحے ناصر پٹنگ سے اٹھ آیا اور فوزیہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر

بولی۔

”فوزیہ میری زندگی، تم کتنی اچھی ہو۔“ وہ شرما کر اس کے سینے سے لگ

گئی۔ جیسے ان مضبوط بازوؤں میں ساجانا چاہتی ہو اور پھر ناصر کے بازوؤں کا دائرہ

تک ہو گیا۔

”تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو؟“

فوزیہ چپ رہی۔

”بتاؤ نا۔“ وہ چل گیا۔

”بتاؤں۔“

”ہاں بتاؤ۔“

اور وہ اک دم نعمانہ کے اوپر جھک گئی اور اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

”اوہو۔ فوزیہ“

”نعمانہ کو پیار کیجئے۔“ فوزیہ نے کہا اور ناصر نے نعمانہ کی پیشانی چوم لی۔

دونوں صبح تک بیٹھے رہے۔ اور پھر معصوم نعمانہ مسکرانے لگی۔

اور شاید زندگی مسکرانے لگی۔

ختم شد